جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مُدیر

پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

تعارف قاضی گروپ آف کمپنیز

اور اللہ ہی نے تمہارے لئے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا (القرآن)

قاضی انٹرپرائزز 1988ء سے پراپرٹی اور کنسٹرکشن کے شعبہ سے منسلک ہیں۔ الحمدللہ جس ادارہ کی بنیاد تقویٰ، توکل، ایمانداری اور جذبہ خدمت خلق پر رکھی گئی تھی اس کو اللہ تعالیٰ نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی سے نوازا۔ رب رحیم کا احسان عظیم ہے کہ ادارہ نے اپنے ذیلی اداروں کی محنت اور تعاون سے ترقی کی اور 1999ء میں تنظیم نو کرتے ہوئے (قاضی گروپ آف کمپنیز) کا آغاز کیا۔ قاضی گروپ آف کمپنیز میں مندرجہ ذیل ادارے شامل ہیں۔

★ قاضی انٹرپرائزز ★ قاضی کنسٹرکشن ★ قاضی پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز ★ قاضی ڈویلپر ★ قاضی پی وی سی پائپ انڈسٹری ★ اسلامک ویلفیئر فاؤنڈیشن

قاضی انٹرپرائزز ہی کیوں

اس لیے کہ

1. ہاؤسنگ کے شعبہ میں بہترین تجربہ کار ٹیم۔
2. 4 منصوبے مکمل کرنے کا اعزاز حاصل (جہاں یا تو ہمارے ممبران رہائش پذیر ہو چکے ہیں اور یا اپنے پلاٹ فروخت کر کے کئی گنا منافع بھی کما چکے ہیں۔ آپ بھی ہمارے منصوبوں میں سرمایہ کاری کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں)
3. **منی بیک گارنٹی** ہماری ہی ہے اگر آپ نے بغیر دیکھے مکان/پلاٹ خریدا اور دیکھنے پر آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بتائے ہوئے منصوبے معیار کے مطابق نہیں ہیں تو آپ اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں
4. ہر اتوار کو ہماری گاڑی دفتر سے صبح نو بجے سائٹ وزٹ کے لیے روانہ ہوتی ہے اسلئے پہلے آپ سائٹ دیکھیں اور پھر خریدیں

ہمارے منصوبے

★ الرحمٰن ٹاؤن (مکمل) ★ پاسبان ٹاؤن (مکمل) ★ گلستان راشد فیز (I) مکمل ★ فیملی ولاز مری فیز (I) فیز (II) مکمل

★ فیملی گارڈن اسلام آباد بکنگ جاری ★ موٹروے سٹی فیز (I) فیز (II) بکنگ مکمل ★ فیملی اپارٹمنٹ مری فیز (III) بکنگ جاری

★ موٹروے سٹی فیز (III) بکنگ جاری ★ قاضی اپارٹمنٹ راولپنڈی بکنگ جاری ★ اسلام آباد بل گارڈن بکنگ جاری

ہمارا دعویٰ ہمارے منصوبے سب سے سستے اور سب سے بہترین، دیکھیں اور فیصلہ کریں

موٹروے سٹی

خصوصیات

- ☆ اسلام آباد کی طرح سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے دامن میں
- ☆ تخت پڑی اور مجوزہ سفاری پارک جیسی سیرگاہیں قریب تر
- ☆ پاکستان موٹروے سے چند منٹ کی مسافت
- ☆ اسلامک سنٹر کے لیے پچاس کنال زمین وقف
- ☆ پانی جیسی نعمت کی فراوانی
- ☆ کشادہ سڑکیں اور گلیاں
- ☆ نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی بدولت ہر آسائش متوقع
- ☆ انشاء اللہ تعالیٰ تمام ضروریات زندگی آپ کے دروازے پر
- ☆ فوج کے ریٹائرڈ افراد پر مشتمل منظم سیکورٹی سسٹم کا قیام
- ☆ قیمتوں میں اضافہ کی بدولت منافع بخش سرمایہ کاری
- ☆ ہر فیز میں شاپنگ سینٹر
- ☆ مسجد، سکول اور ہسپتال گھر کے نزدیک۔

خصوصی رعایت

29 فروری 2000ء تک

پلاٹ بک کرانے والے کو 15 ہزار روپے فی کنال کی خصوصی رعایت

سائز پلاٹ 5 مرلہ، 10 مرلہ، ایک کنال

تمام ادائیگی بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام موٹروے سٹی اکاؤنٹ نمبر 8- 1100 ABL راشد منہاس روڈ برانچ راولپنڈی

یکمشت ادائیگی پر 10 فیصد خصوصی ڈسکاؤنٹ۔ کل قیمت کی پچاس فیصد یکمشت ادائیگی پر فوری رجسٹری

قیمت و طریقہ ادائیگی

قیمت: 9 ہزار روپے فی مرلہ

ایڈوانس: -/1000 روپے فی مرلہ بوقت بکنگ۔

قسط: -/100 روپے فی مرلہ ماہانہ

قاضی انٹرپرائزز

ہیڈ آفس

جنگ بلڈنگ مری روڈ راولپنڈی

فون 554464 فیکس 558633

E-mail: shaukat@isb.comsats.net.pk

web:www.qazi.com.pk

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جلد: ۱۲۷، عدد: ۳، مارچ ۲۰۰۰، ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ

مدیر: پروفیسر خورشید احمد
نائب مدیر: مسلم سجاد

ترتیب

ادارتی امور
منصورہ، ملتان روڈ، لاہور
فون: ۵۴۲۵۳۵۶
فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴
E-mail: tarjuman@pol.com.pk

مدیر انتظامی
عبدالکریم
۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور
فون: ۷۵۸۷۹۱۶
فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ: ۲۰ روپے
زر سالانہ: ۲۰۰ روپے
طلبہ و طالبات کے لیے ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۵۰ روپے
بنگلہ دیش، ایران ۵۰۰ روپے
مشرق وسطیٰ، یورپ
مشرق بعید، افریقہ ۷۰۰ روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۵۰ روپے

تقسیم کار

انسانی زندگی اور تہذیب کو جتنی ضرورت غلظت، شدت اور صلابت[2] کی ہے اتنی ہی ضرورت رقت، نرمی اور لچک کی بھی ہے۔ جتنی ضرورت اچھے سپہ سالاروں، اچھے مدبروں، اور اچھے منتظمین کی ہے، اتنی ہی ضرورت اچھی ماؤں، اچھی بیویوں اور اچھی خانہ داروں کی بھی ہے۔ دونوں عنصروں میں سے جس کو بھی ساقط کیا جائے گا تمدن بہرحال نقصان اٹھائے گا۔

یہ وہ تقسیم عمل ہے جو خود فطرت نے انسان کی دونوں صنفوں کے درمیان کر دی ہے۔ حیاتیات، عضویات، نفسیات اور عمرانیات کے تمام علوم اس تقسیم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ عورت کے سپرد بچہ جننے اور پالنے کی خدمت کا سپرد ہونا ایک ایسی فیصلہ کن حقیقت ہے جو خود بخود انسانی تمدن میں اس کے لیے ایک دائرۂ عمل مخصوص کر دیتی ہے، اور کسی مصنوعی تدبیر میں یہ طاقت نہیں ہے کہ فطرت کے اس فیصلے کو بدل سکے۔ ایک صالح تمدن وہی ہو سکتا ہے جو اولاً اس فیصلے کو جوں کا توں قبول کرے، پھر عورت کو اس کے صحیح مقام پر رکھ کر اسے معاشرت میں عزت کا مرتبہ دے، اس کے جائز تمدنی و معاشی حقوق تسلیم کرے، اس پر صرف گھر کی ذمہ داریوں کا بار ڈالے، اور بیرون خانہ کی ذمہ داریاں اور خاندان کی قوامیت مرد کے سپرد کرے۔ جو تمدن اس تقسیم کو مٹانے کی کوشش کرے گا وہ عارضی طور پر مادی حیثیت سے ترقی اور شان و شوکت کے کچھ مظاہر پیش کر سکتا ہے، لیکن بالآخر ایسے تمدن کی بربادی یقینی ہے، کیونکہ جب عورت پر مرد کے برابر معاشی و تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا جائے گا تو وہ اپنے اوپر سے فطری ذمہ داریوں کا بوجھ اتار پھینکے گی اور اس کا نتیجہ نہ صرف تمدن بلکہ خود انسانیت کی بربادی ہو گا۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی"

"قوانین فطرت"، ترجمان القرآن، جلد ۱۶، عدد ۱، محرم ۱۳۵۹ھ، فروری ۱۹۴۰ء، ص ۴۴-۴۵)

۱- گاڑھا پن ۲- سختی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

دعوت ‘ تربیت اور اقامت دین

جماعت اسلامی کا منصوبہ عمل ۲۰۰۰

پروفیسر خورشید احمد

قرآن پاک کی ہر آیت ہدایت کا منبع اور نور کا سرچشمہ ہے۔ یہ کتاب حق اور صرف حق کا ایک نہ ختم ہونے والا سمندر ہے۔ یہ بھی اس قرآن کا معجزہ ہے کہ اس کی ایک ایک آیت میں ایسے حقائق کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے جن کا مکمل احاطہ فکر انسانی کی پوری تاریخ اور قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی صدیوں کی داستان بھی کماحقہ نہیں کر پاتے۔ ایسی ہی ایک آیت میں فرد اور گروہ‘ معاشرہ اور قوم‘ امت اور انسانیت کے عروج و زوال‘ بناؤ اور بگاڑ‘ ترقی اور تنزل‘ کامیابی اور ناکامی کے عمل (process) کی کنجی کو سنت الٰہی کے ایک بنیادی نکتے کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط (الرعد ۱۳:۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔

آل فرعون اور ان سے پہلے کی قوموں کا ذکر کرتے ہوئے اسی اصول کو یوں بیان کیا گیا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ لا وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (الانفال ۸:۵۳)

یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

دونوں آیات میں تبدیلی کا مدار "انفس" کی تبدیلی کو قرار دیا گیا ہے جو فرد یا قوم کے اندرون کی پوری دنیا پر حاوی ہے۔ گویا انفس ہی وہ زمین ہے جہاں عروج و زوال کی تخم ریزی ہوتی ہے اور پھر یہی وہ بیج اور جڑ ہے جس سے تبدیلی اور انقلاب کا تناور درخت نشوونما پاتا ہے۔ تبدیلی محض بیرونی عوامل کا کرشمہ نہیں ہوتی' یہ اندر کے ایک گہرے اور ہمہ جہتی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ قرآن حکیم پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "انفس" سے مراد اندر کی دنیا کا ایک پورا عالم ہے' بالکل اسی طرح جس طرح "آفاق" سے باہر کی دنیا کا عالم مراد ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ (حم السجدہ ۴۱:۵۳) عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی---- انفس میں وہ تمام قوتیں شامل ہیں جن کا اثر کسی نہ کسی شکل میں انسانی عزائم' اعمال اور اس کی سعی و جہد پر پڑتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انفس عبارت ہے تمام ذہنی اور نفسی' اخلاقی اور عملی قویٰ سے---- تبدیلی اور انقلاب کا آغاز دل ودماغ اور ذہن و ادراک سے ایک اندرونی تبدیلی کی شکل میں ہوتا ہے جو ایمان و ایقان' افکار و احساسات' تصورات اور زندگی کے عزائم کی صورت میں فکروعمل کی صورت گری کرتی ہے۔ یہی وہ صلاحیت ہے جس سے عروج و ترقی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ فرد ہو یا قوم' وہ اپنے اخلاق اور اعمال ہی کے ذریعے بلندی یا پستی سے ہم کنار ہوتی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے قرآن کے اس اصول کو بڑے سادہ اور دل نشیں انداز میں یوں بیان کیا ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

امت مسلمہ کے حالات پر نظر ڈالیے یا پاکستان کے پچھلے نصف صدی کے شب و روز کا تجزیہ کیجیے' صاف نظر آتا ہے کہ بیرونی دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور شرانگیزیوں کو اگر کھل کھیلنے کا موقع ملا ہے تو وہ اسی اندرونی کمزوری کی وجہ سے۔ خرابی کی جڑ قلب و نظر کا فساد اور اندرون (انفس) کا بگاڑ ہے جس کی اصلاح کے بغیر صورت حال میں حقیقی تبدیلی کا امکان معدوم ہے۔ محض در و دیوار کی لیپاپوتی سے امت کے نشات ثانیہ کا حصول ممکن نہیں۔ بلاشبہ نظام کی اصلاح مطلوب بھی ہے اور ناگزیر بھی لیکن اس کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب اس کا نقطۂ آغاز اور محور و مرکز دلوں کی اصلاح' ایمان کی آبیاری اور انفرادی اور اجتماعی تقویٰ کا حصول اخلاق کی بہار ہو۔

مغربی تہذیب نے تبدیلی اور انقلاب کا جو فلسفہ پیش کیا ہے' اس کا سارا انحصار بیرون کی اصلاح اور معاشرے' ریاست اور معیشت کے نظام (structures) کی تبدیلی پر ہے جب کہ اسلام جس انقلاب کا داعی ہے' وہ "اندرون" کی اصلاح سے شروع ہو کر فرد اور معاشرہ دونوں کی مکمل قلب ماہیت کر دیتا ہے

اور اس طرح پورے نظام کی تبدیلی پر منتج ہوتا ہے۔ اسلام اجتماعی زندگی کے بگاڑ کو اس سے بھی زیادہ خطرناک سمجھتا ہے جس کا اظہار مغرب کی فکر و دانش میں کیا جاتا ہے لیکن اسلام کا دعویٰ اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اجتماعی بگاڑ کی اصلاح محض اجتماعی زندگی کے دروبست کو تبدیل کرنے سے نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں برائی نت نئے روپ دھار کر طرح طرح کی نئی شکلوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے اور مرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اجتماعی بگاڑ کی اصلاح کا راستہ بھی نفس کی اصلاح ہی کی وادی سے گزرتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے نہ سمجھ پانے کی وجہ سے مغربی تہذیب کے علم بردار اور محض سیکولر بنیادوں پر زندگی کی تعمیرنو کے داعی برابر تاریکیوں ہی میں ٹانک ٹوئیاں مار رہے ہیں اور انسانیت کے مصائب اور آلام کم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ عالم یہ ہے کہ:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

بیسویں صدی اپنے بہت سے مثبت اور منفی پہلوؤں کی وجہ سے یاد کی جائے گی لیکن عالم اسلام کے نقطۂ نظر سے دو پہلو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس صدی کا آغاز ایسے حالات میں ہوا کہ تقریباً پوری مسلم دنیا مغربی استعمار کے چنگل میں گرفتار تھی اور مغربی تہذیب کے علم بردار اس زعم میں تھے کہ اب ہمیشہ کے لیے وہی دنیا پر قابض رہیں گے۔ لیکن اس صدی کے اختتام تک مغربی استعمار کا سورج تقریباً غروب ہو گیا اور خود اس تہذیب کے بطن سے ایسے ایسے تضادات اور حوادث رونما ہوئے جن کے نتیجے میں اس تہذیب کا رعب ہی ختم نہیں ہوا بلکہ اس کی چولیں تک ہل گئیں اور اقبال کی اس پیش گوئی کے پورا ہونے کے آثار نظر آنے لگے:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپایدار ہو گا

دوسری طرف عالم اسلام کو مغربی استعمار کا پردہ چاک کر کے دوبارہ عالمی سیاسی و معاشی اُفق پر ابھرنے کا موقع ملا۔ احیا کی اس پوری جدوجہد کی اصل نظریاتی اور اخلاقی جڑیں ان دینی تحریکوں کی دعوت کی مرہون منت ہیں جو سقوط خلافت عثمانیہ کے بعد اسلامی دنیا کے مختلف حصوں' خصوصیت سے عالم عربی اور برعظیم میں رونما ہوئیں اور جن کا ہدف منہاج نبویؐ کے مطابق دور حاضر میں دین کی اقامت اور انفس کے اصلاح

کے ذریعے آفاق کی تعمیرنو ہے اور نہ صرف امت مسلمہ بلکہ پوری انسانیت کو نئی زندگی اور نیا نظام دینا ہے۔

اسلام کی اس دعوت کو تحریک اسلامی اس لیے کہا گیا کہ صدیوں کے جمود کو توڑ کر اسلام کو پھر اسی طرح ایک دعوت اور پیغام کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جس طرح سرورعالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفاے راشدین اور صحابہ کرامؓ نے پیش کیا تھا۔ قول و فعل کی ہم آہنگی، اللہ کی رضا اور اس کے دین کے قیام کو ہر دوسری مصلحت پر غالب رکھنا اور فرد کے فکرو نظر اور سیرت و اخلاق سے لے کر معاشرے کے ہر ہر پہلو کی اصلاح اس کا ہدف اور مزاج ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر دعوت ہے جس کا مقصد زندگی کے ہر شعبے میں اہل ایمان کی قیادت میں شریعت کے مطابق اسلام کے نظام عدل و صلاح کا قیام ہے۔ اس تحریک نے دین و دنیا کی تفریق اور مذہب اور سیاست کی دوئی کے جاہلانہ تصورات کو چیلنج کیا اور شریعت کے نفاذ اور اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کی۔ لیکن نظام کی تبدیلی کی یہ جدوجہد مغربی ماڈل پر نہیں بلکہ خالص اسلامی منہج پر ہے جس کی جڑیں ایمان، عمل صالح، انفرادی اور اجتماعی تقویٰ اور دعوت الی الخیر میں ہیں۔ قانون اور نظام کی اصلاح، اس ہمہ گیر جدوجہد کا ایک لازمی حصہ ہے اور یہ اس لیے کہ اجتماعی زندگی کی اصلاح کے بغیر انقلاب کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن نظام کی تبدیلی ایک وسیع تر تبدیلی کا حصہ ہے، اس سے ہٹ کر اس کا کوئی وجود نہیں۔

اجتماع کی اصلاح اور اسلامی حکومت کے قیام پر زور دینے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ دو سو سال اسلامی تاریخ کا وہ منفرد دور ہے جب اسلام اور ملت اسلامیہ قوت و اقتدار سے محروم ہو گئی اور اس کی گرفت رفتار زمانہ پر ڈھیلی پڑ گئی۔ جو امت گیارہ بارہ سو سال تک ایک عالمی طاقت رہی وہ عملاً مغلوب اور محکوم ہو گئی۔ بالآخر ۱۹۲۴ میں خلافت عثمانیہ کی تحلیل سے وہ عالمی سیاسی اُفق پر سے معدوم کر دی گئی۔ فطری طور پر جو چیز چھین لی گئی ہو اس کی بازیافت کو نئی جدوجہد میں ایک مرکزی اہمیت حاصل ہونی چاہیے تھی اور ملّی زندگی میں جہاں خلا واقع ہو گیا تھا اسے بھرنے کی ضرورت کو نمایاں کرنا اور ابھارنا وقت کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریکات کے پروگرام میں امت کی سیاسی آزادی اور مخازن قوت کی اسلامی تسخیر کو اہمیت حاصل ہوئی۔ لیکن اسلامی تحریکات کا یہ پروگرام ایک وسیع تر پروگرام کا حصہ ہے جو فرد کی اصلاح، معاشرے کی تعمیرنو، خیر کی قوتوں کی نظم بندی، نئی صالح قیادت اور اسلامی بنیادوں پر زندگی کے تمام شعبوں کی تعمیر سے عبارت ہے۔ یہ محض "سیاسی اسلام" کا کوئی روپ نہیں، اسلام کی اصل دعوت کو دورحاضر کے تناظر میں کسی سمجھوتے اور کسی مداہنت کے بغیر پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔ ان تحریکات کے امتیازی کردار کو سمجھے بغیر ان پر فتویٰ زنی حق و انصاف سے روگردانی اور دورِ حاضر میں دعوت و تربیت

کی مساعی اور ان کے تقاضوں کو سمجھنے میں ناکامی ہے۔

جس طرح ڈاکٹر یا حکیم مریض کو وہی دوا دیتا ہے جو مرض کا مداوا کر سکے اور وہی مقویات تجویز کرتا ہے جن کی کمی ہو' اسی طرح تحریکات اسلامی نے بھی ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو نظروں سے اوجھل یا معدوم ہو گئے تھے۔

مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے جنوری ۲۰۰۰ کے اجلاس میں جو منصوبہ منظور کیا ہے اس کا دیباچہ' جماعت اسلامی ہی نہیں' عالم اسلام کی اسلامی تحریکات کے مزاج اور منفرد کردار کا مختصر مگر جامع بیان ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ جس میں تحریک اسلامی کی پوری شخصیت کو بہ یک نظر دیکھا جا سکتا ہے۔

ہمارے پیش نظر پوری انسانی زندگی کی حقیقی اصلاح و فلاح ہے۔ ہم نہ محدود معنوں میں مذہبی جماعت ہیں کہ جس کی دلچسپیاں صرف اعتقادی و فقہی اور روحانی و اخلاقی مسائل سے متعلق ہوں اور اجتماعی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ پر اثرانداز ہونے کی عملی کوشش کرنا جس کے دائرہ فرض سے خارج ہو۔ اور نہ ہی ان معنوں میں سیاسی جماعت کہ جس کی سرگرمیوں کا ہدف ہر حال میں اقتدار کی غلام گردشوں تک رسائی ہو۔ ہم پورے کے پورے دین حق کے علم بردار ہیں جو دعوت و تربیت کے عمل سے گزر کر ایک مکمل نظام عدل کی شکل میں عملاً نفاذ بھی چاہتا ہے۔ ہم جس پیغام ہدایت و فلاح کے امین ہیں وہ اشخاص اور گروہوں کی دوستی اور دشمنی سے بالاتر ہے۔ ہم کسی فرد' گروہ یا طبقے کے مخالف نہ کبھی تھے نہ آج ہیں۔ فی الحقیقت ہم اپنی پوری قوم بلکہ پوری انسانیت کے بہی خواہ ہیں حتیٰ کہ وہ تمام عناصر جو ہمارے مشن کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے ہمیں خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کر بیٹھے ہیں ہم ان کے لیے بھی اپنے ذہن کے کسی گوشے میں خیرخواہی کے سوا کوئی جذبہ نہیں رکھتے۔ ہم الدین النصیحۃ کی ہدایت پر عمل کرتے ہیں۔

جس طرح ہماری دعوت ایک اصولی انقلاب کی دعوت ہے اسی طرح ہماری کش مکش بھی ایک اصولی کش مکش ہے۔ دعوت و کش مکش کے اس سارے کام سے ہمارا اصل مطلوب خدا پرست' خدا کی رضا ہی کے طالب اور بے لوث انسانوں کو تیار کرنا' ان کو منظم کرنا اور ان کو تربیت دے کر احیاے اسلام کے کام میں لگانا ہے جو اپنے ذاتی مفاد سے قطع نظر کر کے بے لوثی کے ساتھ تعمیرملت اور اصلاح امت کا عظیم فریضہ سرانجام دے سکیں اور جن کے ذریعے ایک طرف ہم عوام کی صحیح ذہنی اور اخلاقی نشوونما کا کام کر سکیں اور دوسری طرف سیاسی نظام اور معاشی ادارت کو اسلامی تصورات کے ڈھانچے میں ڈھال سکیں۔ ہر کارکن کو اور بالخصوص ہر سطح

کے ذمہ دار کو سال کے آغاز میں اپنا منصوبہ عمل تیار کرتے ہوئے ان بنیادی حقیقتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

سب سے پہلے ذہنوں میں اس بات کو تازہ کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ دعوت کیا ہے جس طرف جماعت اسلامی پاکستان اپنے اہل وطن اور پوری امت مسلمہ کو' اور بالآخر پوری انسانیت کو' بلاتی ہے۔ اس کی دعوت نہ کسی شخصیت کی طرف ہے اور نہ کسی مخصوص مسلک کی طرف۔ اس کی دعوت صرف ایک اللہ کی عبادت اور اس کے رسولؐ کی پیروی کی دعوت ہے۔ یہ اسی راستے کی دعوت ہے جس کی طرف تمام انبیا کرام نے انسانیت کو بلایا اور جس کا آخری نمونہ اسوۂ محمدیؐ میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ دنیا کی زندگی کو آخرت کی کامیابی کے تابع کرنے کی دعوت ہے۔ یہ دین کے کسی جز یا اخلاق کے ایک یا چند پہلوؤں کی نہیں' پورے دین اور پوری زندگی کو صبغۃ اللہ میں رنگ دینے کی دعوت ہے۔ یہ جزئیات اور فروع میں گم ہونے کی نہیں بلکہ دین کی حقیقی ترجیحات کو قبول کرنے' اہم اور اولیت کی حامل چیزوں کو اولیت کا درجہ دینے اور تفصیل اور فروع کو اس کے اپنے مقام پر رکھنے کی دعوت ہے۔ یہ مسجد اور میدان کارزار' خانقاہ اور جہاد' مدرسہ اور کاروبار حیات' ذکر و فکر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک لڑی میں پرونے اور ایک مربوط جہاد زندگانی کے ناقابل تقسیم اجزا بنانے کی دعوت ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جسے اپنے اور پرائے دونوں ہی غتربود کر دیتے ہیں اور تحریکی ترجیحات کو اپنے اپنے ذاتی ذوق کے مطابق نہ پا کر نکتہ سنجی فرمانے لگتے ہیں۔ "سیاسی اسلام" "راہ تقویٰ سے انحراف" اور "مسلک سلف سے فرار" کے طعنے دیے جانے لگتے ہیں۔ ان تمام کرم فرمائیوں پر دعوت اسلامی کے علم برداروں کا ردعمل مخاصمانہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ پوری خود احتسابی کے ساتھ اپنی دعوت اور اس کے ہمہ پہلوؤں کی مخلصانہ پابندی اور وفاداری کا رویہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ صحیح مثالیہ (model) سامنے آسکے اور زبان حال سے غلط اندیشیوں کی تردید ہو سکے۔

اس دعوت کا خلاصہ بانی تحریک نے دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات میں یوں بیان کیا ہے:

۱۔ یہ کہ ہم بندگان خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔

۲۔ یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرلے' یا اس کو ماننے کا دعویٰ اور اظہار کرے' اس کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کرے' اور جب وہ مسلمان ہے یا بنا ہے تو مخلص مسلمان بنے اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہو جائے۔

۳۔ یہ کہ زندگی کا نظام جو آج باطل پرستوں اور فساق و فجار کی رہنمائی میں چل رہا ہے' اور معاملات دنیا کی زمام کار جو خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے' ہم دعوت دیتے ہیں کہ اسے بدلا جائے اور رہ نمائی و امامت' نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے مومنین صالحین کے ہاتھوں میں منتقل ہو۔

اس دعوت کو جماعت اسلامی کے دستور میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

اقامت دین سے مقصود دین کے کسی خاص حصے کی اقامت نہیں ہے بلکہ پورے دین کی اقامت ہے' خواہ اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے' نماز' روزہ اور حج و زکوٰۃ سے ہو یا معیشت و معاشرت اور تمدن و سیاست سے' اسلام کا کوئی حصہ بھی غیر ضروری نہیں ہے۔ پورے کا پورا اسلام ضروری ہے۔ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ اس پورے اسلام کو کسی تجزیہ و تقسیم کے بغیر قائم کرنے کی جدوجہد کرے۔ اس کے جس حصے کا تعلق افراد کی اپنی ذات سے ہے' ہر مومن کو اسے بطور خود اپنی زندگی میں قائم کرنا چاہیے۔ اور جس حصے کا قیام اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہیں ہو سکتا' اہل ایمان کو مل کر اس کے لیے جماعتی نظم اور سعی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اگرچہ مومن کا اصل مقصد زندگی رضائے الٰہی کا حصول اور آخرت کی فلاح ہے' مگر اس مقصد کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں خدا کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لیے مومن کا عملی نصب العین اقامت دین اور حقیقی نصب العین وہ رضائے الٰہی ہے جو اقامت دین کی سعی کے نتیجے میں حاصل ہو گی۔

فرد اور معاشرے کی اصلاح اور بالآخر انقلاب قیادت اور اسلامی نظام عدل و مساوات کے قیام کا یہ کام بہ یک وقت دو جہتوں سے مساعی کا متقاضی ہے۔ اپنی اصلاح' ایک دوسرے کی اصلاح' اور نظام زندگی اور قوت و اقتدار کی اصلاح ایک ہی کوشش اور جدوجہد کے مختلف رخ اور پہلو ہیں جو ایک دوسرے کی تقویت اور تکمیل کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ الگ الگ دنیا نہیں ہیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ ایک طرف ہر فرد کو یہ دعوت دی جائے کہ وہ اپنے رب کو پہچانے' اس سے کیے ہوئے عہد (کلمہ طیبہ) کے تقاضوں کو جاننے اور پورا کرنے کی کوشش کرے' اپنی' اپنے خاندان' اہل و عیال اور اہل محلہ کی اصلاح کی کوشش کرے' اللہ کے تمام بندوں تک پہنچے اور انھیں بندگی کی زندگی کی دعوت دے' وہیں' اس بات کی ضرورت ہے کہ اجتماعی زندگی کے نظام اور محرکات کو اسلامی زندگی کے قیام اور فروغ کے لیے استعمال کیا جائے۔ تمام اجتماعی قوتوں' اور خصوصیت سے ریاست کے وسائل کو' ایمان کی آبیاری' صالحیت کے فروغ' نواہی کے خاتمے اور

معروف کے قیام کے لیے استعمال کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں' ایک طرف "خود اپنے کو بدلو" کی کوشش ہو تو دوسری طرف اجتماعی ماحول اور ریاست کے وسائل' اوامر کے نفاذ اور بدی' ظلم اور طغیان کے استیصال کے لیے استعمال ہوں تاکہ خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری ہو سکے اور اس کا قانون جاری و ساری ہو سکے۔ یہ دونوں کام ایک دوسرے کے معاون اور تکمیل کرنے والے ہیں۔ ان میں "یہ یا وہ" (or either) کا تعلق نہیں بلکہ یہ دو جڑواں بھائیوں کی طرح ہیں' جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:

الاسلام والسلطان اخوان توامان لا یصلح واحد منھما الا لصاحبہ فالاسلام اس والسلطان حارس واما اللّٰہ لا یھدم وما لاحارس لہ' ضائع (کنز العمال)

اسلام اور حکومت و ریاست دو جڑواں بھائی ہیں' دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت گویا اس کی نگہبان ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ گر جاتی ہے اور جس کا کوئی نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جا سکتا ہے۔

آج کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ اسلام کی یہ عمارت اپنے ارکان کی بنیاد پر معاشرے میں مستحکم ہو اور حکومت و ریاست اس کی نگہبانی کی ذمہ داری موثر انداز میں ادا کرے۔

اصلاح فرد و معاشرہ اور اصلاح حکومت اور انقلاب قیادت ایک ہی جدوجہد کے دو پہلو اور محاذ ہیں اور ہر محاذ اپنی جگہ اہم اور دوسرے محاذ کو تقویت دینے والا ہے۔ دعوت و تربیت کا ہدف یہ دونوں محاذ ہیں۔ کسی ایک کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ عوامی اصلاح اور تربیت' جماعت اسلامی کے لائحہ عمل کا اتنا ہی اہم پہلو ہے جتنا انقلاب قیادت اور اسلامی حکومت کا قیام۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ۱۹۵۱ میں لائحہ عمل کے جو چار نکات پیش کیے تھے اور پھر ۱۹۵۷ میں جن کو جماعت کی پالیسی کا مرکز و محور قرار دیا گیا تھا انھیں آج تک جماعت کی حکمت عملی میں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ ۲۰۰۰ء کے منصوبہ عمل میں اس پروگرام پر موثر عمل کو جماعت کے دعوت و تربیت کے اس سال کا ہدف قرار دیا گیا ہے۔ مولانا مرحوم کے الفاظ میں اس کام کے بڑے بڑے شعبے اور پہلو یہ ہیں جن کی تذکیر' دعوت و تربیت کے اس سال کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتی ہے تاکہ ہدف اور وژن میں کوئی ابہام نہ رہے۔

(الف) مذہبی گوشے میں کارکنان جماعت کو یہ کام کرنے ہوں گے:

۱۔ عوام الناس کو اطاعت خدا و رسولؐ کی طرف بلانا' ان میں آخرت کی بازپرس کا احساس بیدار کرنا' ان کو نیکی اور بھلائی کی تلقین کرنا' اور انھیں اسلام کی حقیقت سمجھانا۔

۲۔ عام لوگوں کو ان ضروری احکام دینی سے باخبر کرنا جن کا جاننا مسلمانوں کی سی زندگی بسر کرنے

کے لیے ناگزیر ہے۔

۳۔ مساجد کی حالت درست کرنا اور ان کے لیے مسلم معاشرے میں مرکزی اہمیت پیدا کرنا۔

۴۔ مذہبی جھگڑوں کو روکنا اور لوگوں کو اس کش مکش کے نقصانات کا احساس دلانا۔

(ب) اخلاقی گوشے میں ہمارے کارکنوں کو تین کاموں پر اپنی قوت صرف کرنا ہو گی:

۱۔ غنڈا گردی کا انسداد' ۲۔ ہر قسم کے فواحش کا انسداد' ۳۔ رشوت و خیانت کی روک تھام۔

ان اغراض کے لیے ہم صرف اخلاقی تلقین ہی پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے بلکہ معاشرے کے شریف عناصر کو ان برائیوں کے مقابلے میں منظم کر کے ان کے خلاف عملی جدوجہد بھی کرنا چاہتے ہیں۔

(ج) معاشی گوشے میں ہم کوشش کریں گے کہ تین طرح کی خدمات انجام دی جائیں:

۱۔ توخذ من اغنیاء هم فترد علی فقراء هم کے شرعی اصول پر بستیوں کے غریبوں' محتاجوں اور معذوروں کی باقاعدہ اعانت کا انتظام اور اس کے لیے انھی بستیوں کے ذی استطاعت لوگوں سے مدد لینا۔

(د) سرکاری محکموں اور اداروں سے عام لوگوں کی شکایات رفع کرانا اور دادرسی حاصل کرنے کے معاملے میں جس حد تک ممکن ہو' ان کی مدد کرنا۔

(ر) بستیوں کے لوگوں میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ پیدا کرنا تاکہ خود ہی مل جل کر اپنی بستیوں کی صفائی اور راستوں کی درستی اور حفظان صحت کا انتظام کر لیا کریں۔

(ز) تعلیمی گوشے میں ہماری کوشش یہ ہو گی:

۱۔ بستیوں اور محلوں میں دارالمطالعے کھولنا۔

۲۔ تعلیم بالغاں کے مراکز قائم کرنا۔

۳۔ جہاں جہاں بستیوں کے لوگ مالی ذرائع فراہم کرنے پر تیار ہوں وہاں ایسے پرائمری اسکول قائم کرنا جن میں سرکاری نصاب پڑھانے کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی ہو۔

جماعت اسلامی کے سامنے ایک مکمل اسلامی معاشرہ اور ریاست کا قیام ہے اور اس کے کارکن اس جدوجہد کو وقت کا اہم ترین چیلنج سمجھتے ہیں۔ وہ دلوں کی نگری کو ایمان اور احتساب سے منور کر کے پورے معاشرے کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے منور کرنا چاہتے ہیں اور ساری جدوجہد اللہ کے بھروسے پر اس یقین کے ساتھ انجام دے رہے ہیں کہ:

جان چو دیگر شد' جہاں دیگر شود

اس منصوبے کا ایک مرکزی نکتہ قرآن کی طرف دعوت اور قرآن کے ذریعے زندگی اور نظام زندگی کو بدلنے کا عزم اور سعی ہے۔ الحمدللہ اس وقت بھی مطالعہ قرآن کے ہزاروں حلقے مردوں میں اور خواتین میں قائم ہیں۔ ہدف یہ ہے کہ پورے ملک میں مردوں اور عورتوں کے لیے بہت بڑی تعداد میں قرآن سرکل قائم کیے جائیں۔ جگہ کی قید نہیں' گھر کی بیٹھک ہو' مسجد کا دالان ہو' مدرسہ کا حجرہ ہو' کالج کی کلاس ہو' درخت کی چھاؤں ہو یا کمیونٹی ہال کی آسائش--- اسے قرآن کے اجتماعی مطالعے کا گہوارہ بنا دیا جائے۔ چھوٹا اجتماع ہو یا بڑا مجمع--- ہر مسلمان مرد اور عورت اور بچے اور جوان کو آمادہ کیا جائے کہ قرآن سے اپنا رشتہ جوڑے' اس کے معنی و مفہوم کو سمجھے اور اسے اپنے لیے کتاب ہدایت بنا لے۔ لمبی چوڑی علمی بحثوں اور تفسیری محفلوں کا اپنا مقام ہے اور ان کی افادیت سے انکار ممکن نہیں لیکن اس پروگرام کا اصل مقصد ہر مسلمان کو' خواہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا ناخواندہ' قرآن پاک کو پڑھنے اور اس کے ترجمے اور مفہوم سے واقفیت پیدا کرنے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ مسلمانوں کی طاقت کا اصل سرچشمہ اللہ کی یہی کتاب ہے۔ جب بھی مسلمانوں نے اس کا دامن تھاما اور اس کے پیغام کو لے کر اٹھے وہ بلندیوں اور کامیابیوں سے شادکام ہوئے اور جب بھی وہ اس سے غافل ہوئے وہ پستیوں اور ذلتوں کی طرف لڑھک گئے۔ سب سے سچے انسان صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللّٰہ یرفع بھذا الکتب اقواما ویضع بہ آخرین (مسلم) بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کتاب (قرآن پاک) کی بدولت بہت سی قوموں کو بام عروج پر پہنچائے گا اور اس (کو ترک کرنے) کے باعث دوسروں کو رسوا کردے گا۔ اقبال نے اس حقیقت کو اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اور

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکر ملت ز قرآن زندہ است

اس کتاب پر ثبات نے دور اول میں مسلمانوں کو اوج ثریا سے ہم کنار کیا تھا اور یہی آج بھی ان کی قسمت بدل سکتی ہے اور انھیں ذلت اور پستی سے نکال کر امامت اور قیادت کے اعلیٰ مقامات پر متمکن کر سکتی ہے۔ سچ کہا امام مالکؒ نے: لَا یَصْلَحُ اٰخِرُ ھٰذِہِ الامۃ اِلاَّ بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا اس امت کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی مگر اس طریقے کے اختیار کرنے سے جس سے اس کے اولیں دور میں ترقی اور اصلاح پائی--- اور وہ ہے قرآن!

منصوبہ عمل ۲۰۰۰ میں قرآن کی تعلیم کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن کو باترجمہ پڑھنا اور اس کے

پیغام کو سمجھنا اور سمجھانا، نیز اس کام کو انجام دینے کے لیے ہر ضلع میں ایسے افراد کو تیار کرنا جو صحت کے ساتھ قرآن پڑھ سکیں، دوسروں کو پڑھا سکیں اور اس کا مطلب سمجھا سکیں۔ دعوت و تربیت کے اس سال کا اصل پروگرام قرآن سے اس رشتے کو مضبوط کرنا اور اس کے ذریعے قوم کو روشنی کی راہ دکھانا اور اپنی کھوئی ہوئی منزل کی طرف گامزن کرنا ہے۔

گھر کی اصلاح اور خاندان کے یونٹ کو اقامت دین کی جدوجہد کا بنیادی پتھر بنا دینا اس کا دوسرا ہدف ہے۔ خاندان کی بنیاد محض ایک رسمی رشتہ نہیں۔ یہ تہذیب کا گہوارہ اور اسلامی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے سب سے اولیں اور کارفرما ادارہ ہے۔ شریعت میں ایمانیات اور عبادات کے بعد سب سے زیادہ ہدایت جس ادارے کے بارے میں ہے وہ خاندان ہی کا ادارہ ہے۔ خود حضور پاکؐ کو دعوت کے باب میں ہدایت فرمائی گئی کہ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ○ (الشعراء ۲۶:۲۱۴) (پس اے نبیؐ) اپنے قریب ترین رشتے داروں کو ڈراؤ---- تمام مسلمانوں سے فرمایا گیا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (التحریم ۶۶:۶) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے---- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان والدین کو جنت کی بشارت دی جو اپنی اولاد کی صحیح تربیت کریں اور جو امانت ان کو سونپی گئی ہے اسے پورا پورا ادا کر دیں۔

آج خاندان کا نظام اندرونی ٹوٹ پھوٹ اور شکست و ریخت کے عمل سے دوچار ہے۔ اپنوں کی جہالت اور غفلت اور بیرونی دشمنوں کی ہمہ گیر یلغار دونوں کے باعث دین و تہذیب کا یہ حصار تباہی کی زد میں ہیں۔ اس قلعے کی حفاظت اور اسے ایک بار پھر اسلامی قوت کا منبع بنانا ہماری اولیں ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں مسلمان خواتین کا کردار سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن وہ اپنا کردار اسی وقت ادا کر سکتی ہیں جب ہم ان کے حقوق پورے پورے ادا کریں اور انھیں عضو معطل بنا کر نہ رکھیں بلکہ ان کو وہی مقام دیں اور مواقع فراہم کریں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو مطلوب ہیں۔ قرآن حق و باطل کی کش مکش کے سلسلے میں مردوں اور عورتوں کو ایک ہی زبان میں خطاب کرتا ہے اور ایک ہی ذمہ داری کو ادا کرنے کی طرف بلاتا ہے، لیکن ہم قرآن کی اس پکار کو غفلت سے نظرانداز کر دیتے ہیں۔

جماعت اسلامی کے دعوت و تربیت کے پروگرام میں گھر کی اصلاح، اہل خاندان اور قرابت میں دعوتی کام اور مردوں اور خواتین کا دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داریوں کو اپنے اپنے دائروں، صلاحیتوں اور امکانات کے مطابق انجام دینے کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔

اس پروگرام کا ایک اور بڑا اہم حصہ بامقصد اور اسلامی اقدار پر مبنی تعلیم کا فروغ ہے۔ موجودہ تعلیمی صورت حال میں ضروری ہو گیا ہے کہ اہل خیر اچھی اور اسلامی اقدار پر مبنی تعلیم کی فراہمی کا انتظام نجی شعبے میں کریں اور ایک ایسی ملک گیر تعلیمی تحریک برپا کریں کہ ایک متبادل صحت مند نظام وجود میں آ جائے۔ سرکاری سطح پر اصلاح کے امکانات کم سے کم ہونے کے بعد اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ملک و ملت کے بہی خواہ اوپر سے تبدیلی کا انتظار کیے بغیر اپنی نسل کو آگ کی لپیٹ سے بچانے اور اپنے دین و ثقافت کی حفاظت کے لیے جس طرح بیرونی استعمار کے دور میں اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے خود کوشاں ہوئے تھے، اسی طرح اندرونی استعمار سے ٹکر لینے کے لیے خود ہی اپنے بچوں کی بہتر تعلیم کا بندوبست کریں۔ جماعت اسلامی نے "اسلامی نظامت تعلیم" قائم کی ہے اور صوبائی اور مقامی سطح پر وقف کی بنیاد پر، یا خود کفالت کے نظام کے تحت ملک بھر میں اچھے تعلیمی اداروں کا ایک جال بچھا دینا چاہتی ہے۔ الحمدللہ، پچھلے چند برسوں کی کوشش سے کئی ہزار پرائمری اور سیکنڈری اسکول اس منصوبے کے تحت قائم ہوئے ہیں۔ اس سال ان میں خاطرخواہ اضافے کی کوشش کی جائے گی اور جن شہروں یا دیہات میں ابھی ایسے ادارے قائم نہیں ہو سکے ہیں وہاں مقامی آبادی اور اہل خیر کے تعاون سے جلد از جلد ان کے قیام کا اہتمام کیا جائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ جس طرح مغرب کے زیراثر تعلیمی تحریک نے بقول اقبال، تعلیم کے "تیزاب" میں مسلمان قوم کی خودی کو ڈال کر اپنے مفید مطلب انداز میں بگاڑنے کی کوشش کی، یہ اصلاحی تحریک اس قوم کی نئی نسلوں کو پھر اسلام کا سپاہی اور پاسبان بنانے میں اہم کردار ادا کرے گی اور ان شاء اللہ "دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے"۔

حکومت کی تعلیمی پالیسی پر تنقید، اس کی ناکامیوں کا احتساب اور صحیح نظام تعلیم کا مطالبہ اسی طرح جاری رہے گا لیکن اپنی مدد آپ کے تحت ایک متبادل نظام بھی قائم کرنا ضروری ہے۔

معاشرے سے ظلم و طغیان، فتنہ و فساد اور فحاشی اور عریانی کا خاتمہ، اور مظلوم کی مدد اور ظالم کا ہاتھ روکنے اور ظلم کے خلاف فضا بنانے کی کوشش بھی اس پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ لوگوں میں اپنے حقوق کا احساس پیدا کرنا اور حق کے لیے کھڑے ہونے کا داعیہ اور حوصلہ پیدا کرنا بھی تحریک اسلامی کے اہداف میں سے ہے۔ دعوتی اور تربیتی پروگرام میں معاشرے کی اصلاح کے ان پہلوؤں کو نمایاں کرنا اور اس کام کو انجام دینے کے لیے مردان کار تیار کرنا ایک مشکل لیکن ضروری کام ہے۔ سیاسی بیداری اور ہر سطح پر نئی اور صاف ستھری قیادت ابھارنا بھی اسی جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔ ممبرسازی، رابطہ کمیٹیوں کا قیام اور مجالس

مشاورت کی تشکیل کا مقصد یہی ہے۔ یہ تمام کام اس لیے انجام دیا جا رہا ہے کہ ایک خادم دین اور خادم عوام قیادت ابھر سکے اور بالآخر ملک کی زمام کار ان لوگوں کے ہاتھوں میں آسکے جو شر اور فساد' رشوت اور غبن' حقوق کی پامالی اور ظلم و استحصال کا خاتمہ کر سکیں اور معاشرے میں خیر اور فلاح کو عام کر سکیں۔

یہ وہ تحریک ہے جو دعوت و تربیت کے ذریعے معاشرے کی اصلاح' اور نئے مردان کار کی تیاری کرے گی تاکہ ان کی اجتماعی جدوجہد کے ذریعے نئی قیادت بروے کار آئے اور اجتماعی نظام بشمول نظام حکومت تبدیل ہو۔ اگر اس کا نقطۂ آغاز اپنی اصلاح ہے تو نظام کی اصلاح اور زمانے کی رو کی تبدیلی اس کا متوقع ہدف ہے۔ اور یہ سارا کام کسی دنیوی منفعت کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا' اللہ کے بندوں کی خدمت اور آخرت کی کامیابی کے لیے انجام دیا جانا چاہیے۔ اگر یہ سارا کام اور ساری تگ و دو صرف اللہ کے بھروسے پر انجام دی جائے تو ان شاء اللہ لازماً ثمرآور ہو گی۔

ہم نے ۲۰۰۰ء کے منصوبہ عمل کے صرف چند پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔ پورا منصوبہ تحریک کی دعوت کے مختلف پہلوؤں کا کماحقہ' احاطہ کرتا ہے اور کارکنوں کو اپنی منزل کی طرف گامزن ہونے کے لیے واضح خطوط کار فراہم کرتا ہے۔ ہر منصوبہ محض کاغذ کا ایک پرزہ ہے اگر اس پر عمل نہ ہو اور اس کے اہداف کو حاصل کرنے کے لیے تن' من' دھن کی بازی نہ لگا دی جائے۔ ہماری دعوت اور ہمارے منصوبے کی کامیابی کا انحصار اللہ تعالیٰ کی استعانت کے بعد کارکنوں کے جذبہ' محنت اور قربانی پر ہے۔ یہ جہاں ایک طرف "اپنی اصلاح آپ" کا نسخہ ہے' وہیں دوسروں کی اصلاح اور خدمت اور معاشرے کی تعمیر و تشکیل نو کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے پہلی ضرورت اللہ پر بھروسہ' اس کے دامن کو تھامنا' اس سے اپنا رشتہ مضبوط اور گہرا کرنا' اس کی رضا کی طلب اور اس کی محبت کی خواہش ہے۔ جتنا یہ جذبہ مضبوط اور صائب ہو گا اتنا ہی ہمارا راستہ آسان ہو جائے گا۔

اس کے لیے دوسری ضرورت خود اپنے کو تیار کرنا ہے۔ اگر شمع خود روشن نہ ہو تو دوسروں کو روشنی کیسے پہنچائے گی۔ اگر برف میں برودت اور آگ میں حرارت نہ ہو تو دوسروں کو ٹھنڈک یا گرمی کیسے پہنچا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کا نبی جو داعیٔ اول ہوتا ہے وہ سب سے پہلے ایمان لانے والا اور سب سے پہلے اطاعت کرنے والا ہوتا ہے (انا اول المومنین وانا اول المسلمین)۔ کارکن اور قیادت' ہر سطح پر' ہم میں سے ہر ایک کو' سب سے پہلے خود اپنی فکر کرنی چاہیے اور اس جذبے سے کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں خود بھی دین پر قائم رہنے اور اس راہ پر ترقی کرنے کی توفیق بخشے اور اس لائق بنائے کہ ہم شہادت حق کا فریضہ کماحقہ' ادا کر سکیں:

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

اس کے لیے اخلاص کے ساتھ ساتھ علم' قول و فعل کی یک رنگی' حسن اخلاق' جذبۂ خدمت' حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی پاس داری' صبر اور تحمل' مسلسل جدوجہد' کوشش اور قربانی کے جذبے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے کی ایک اور بڑی اہم ضرورت اپنے دائرے سے نکل کر دوسروں تک پہنچنا' عوام میں اٹھنا بیٹھنا' ان سے محبت اور ہمدردی کا معاملہ کرنا' ان کے دکھ درد میں شریک ہونا اور ان کے دلوں کو موہ لینا ہے۔ یہ کام خودرائی' خودپسندی اور احساس برتری کے ساتھ انجام نہیں پا سکتا۔ حضورپاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک میں جہاں ہمیں خوش اخلاقی کا اعلیٰ ترین نمونہ نظر آتا ہے (وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ○ القلم ۶۸:۴) وہیں آپ کے تمام معاملات' رہن سہن اور ملاپ میں بلا کا انکسار اور عام انسانوں جیسی سادگی اور ملنساری پائی جاتی ہے۔ حضرت عائشہؓ کی گواہی ہے: آپؐ فرماتے تھے: اجلس کما یجلس العبد میں اسی طرح اٹھتا بیٹھتا ہوں جس طرح خدا کا ایک عام بندہ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ جب آپؐ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا والی بنا کر بھیجا تو نصیحت فرمائی: احسن خلقكَ للناس لوگوں کے ساتھ بہتر اخلاق سے پیش آنا۔

آپؐ کا شوق دعوت اور دوسروں کی فکر گیری کی حالت یہ تھی کہ خود اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں آپؐ کو متوجہ فرماتا ہے کہ اے نبی! شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے (لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ الشعراء ۲۶:۳)۔ آپ کی لگن اور فکرمندی کا یہ حال تھا کہ آپؐ نے فرمایا کہ لوگ پروانوں کی طرح آگ میں گر رہے ہیں اور میں ان کی کمر پکڑ پکڑ کر ان کو آگ میں گرنے سے روک رہا ہوں۔ آپؐ کی استقامت کی یہ کیفیت تھی کہ آزمایش کے سخت ترین مرحلے پر بھی برملا فرمایا: خدا کی قسم! اگر تم میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دو تو پھر بھی میں بندگیٔ رب کی دعوت سے قطعاً باز نہیں آؤں گا' میں اس راہ میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں' پسپائی اختیار نہیں کر سکتا۔ احساس ذمہ داری کا یہ حال تھا کہ جب تھکے ہارے بخار کے عالم میں دارالارقم میں آرام کے چند لمحات کے دوران یہ اطلاع ملتی ہے کہ ایک قافلہ مکہ کے باہر آیا ہے تو دعوت پہنچانے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں اور اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کہتے ہیں آپؐ تھکے ہوئے ہیں' طبیعت بھی ناساز ہے' اس وقت آرام فرمالیں تو آپؐ کا ارشاد یہی ہوتا ہے کہ کیا خبر کل تک وہ قافلہ رخصت ہو جائے اور کیا پتا کل تک میرا ہی بلاوا آجائے! آرام اور استراحت ترک کر دیتے ہیں اور دعوت پہنچانے کے لیے روانہ ہو جاتے

ہیں--- صلی اللہ علیہ وسلم!

دعوت' تربیت اور اقامت دین کا کام انجام دینے کے لیے اس عزم' اس ہمت' اس ولولے' اس احساس ذمہ داری اور اس مجاہدے کی ضرورت ہے:

نگہ بلند' سخن دل نواز' جاں پُرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ صرف میرکارواں ہی کے لیے نہیں' ہر کارکن اور اس منزل کے ہر راہ رو کے لیے یہی رخت سفر ہے۔

اللھم اید الاسلام والمسلمین - اللھم انصر من نصر دین محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم وجعلنا منھم واخذل من خذل دین محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم ولا تجعلنا معھم۔

اللھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه۔

اے اللہ! اسلام اور مسلمانوں کی مدد فرما'

اے اللہ! جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدد اور اسے قائم کرنے کی سعی کریں تو ان کی مدد فرما اور ہمیں ان میں سے کر دے

اور جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو رسوا کرے' تو ان کو رسوا کر دے اور ہم کو ان کے ساتھ نہ کرنا۔

اے اللہ! ہمیں حق کو حق دکھا اور اس کی پیروی کی توفیق عنایت فرما۔

اور باطل کو باطل دکھا' اور اس سے بچنے کی توفیق عنایت فرما--- آمین!

(ری پرنٹ دستیاب ہیں: منشورات ' منصورہ' لاہور)

میری انتہائی کوشش یہ ہے کہ ہر شخص جو جماعت میں داخل ہو' وہ اس بڑے پروگرام کو سمجھے اور اس پر عمل درآمد کرے جو شعوری مسلمان ہونے کے ساتھ ہی آپ سے آپ اس کی زندگی کے لیے قرار پا جاتا ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں اپنے رفقا سے بسا اوقات اس قسم کی باتیں سنتا ہوں کہ "ہمارے لیے کرنے کا کام کیا ہے؟" میں پوچھتا ہوں کہ کیا اپنی تمام کمزوریوں کو آپ دور کر چکے ہیں؟ کیا ان تمام حقوق کی ادائیگی سے بھی آپ فارغ ہو چکے ہیں جو اللہ اور اس کے دین کی طرف سے آپ کے دماغ پر' آپ کے دل پر' آپ کے اعضاء و جوارح پر' آپ کی ذہنی و جسمانی قوتوں پر اور آپ کے مملوکہ اموال پر عائد ہوتے ہیں؟ اور کیا آپ کے گردوپیش کوئی انسان بھی خدا سے غافل یا گمراہ یا دین حق سے ناواقف یا اخلاقی پستیوں میں گرا ہوا باقی نہیں رہا ہے جس کی اصلاح کا فرض آپ پر عائد ہوتا ہو؟---اگر ایسا نہیں ہے تو آپ کے اندر یہ تخیل آ کہاں سے گیا کہ آپ کے لیے کرنے کا کام کوئی نہیں رہا ہے اور آپ کو کچھ اور کام بتایا جائے جس میں آپ مشغول ہوں۔ یہ سارے کام تو ان ہوئے پڑے ہیں جو آپ سے ہر وقت کا شدید انہماک چاہتے ہیں اور ایک لمحہ دم لینے کی فرصت بھی نہیں مل سکتی۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

(روداد جماعت اسلامی' حصہ اول' ص ۷۸-۷۹)

(خیر خواہ)

اللہ سے معاہدہ

ایمان محض ایک مابعد الطبیعاتی عقیدہ نہیں ہے بلکہ فی الواقع وہ ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے بندہ اپنا نفس اور اپنا مال خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور اس کے معاوضے میں خدا کی طرف سے اس وعدے کو قبول کر لیتا ہے کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں وہ اسے جنت عطا کرے گا۔ اس اہم مضمون کے تضمنات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس بیع کی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے' اس کے لحاظ سے تو انسان کی جان و مال کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے' کیونکہ وہی اس کا اور ان ساری چیزوں کا خالق ہے جو اس کے پاس ہیں اور اسی نے وہ سب کچھ اسے بخشا ہے جس پر وہ تصرف کر رہا ہے۔ لہٰذا اس حیثیت سے تو خرید و فروخت کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ نہ انسان کا اپنا کچھ ہے کہ وہ اسے بیچے' نہ کوئی چیز خدا کی ملکیت سے خارج ہے کہ وہ اسے خریدے۔ لیکن ایک چیز انسان کے اندر ایسی بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کلیتاً اس کے حوالے کر دیا ہے' اور وہ ہے اس کا اختیار' یعنی اس کا اپنے انتخاب و ارادہ میں آزاد ہونا۔ اس اختیار کی بنا پر حقیقت نفس الامری تو نہیں بدلتی مگر انسان کو اس امر کی خود مختاری حاصل ہو جاتی ہے کہ چاہے تو حقیقت کو تسلیم کرے ورنہ انکار کر دے۔ بالفاظ دیگر اس اختیار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان فی الحقیقت اپنے نفس کا اور اپنے ذہن و جسم کی قوتوں کا اور ان اقتدارات کا جو اسے دنیا میں حاصل ہیں' وہ مالک ہو گیا ہے اور اسے یہ حق مل گیا ہے کہ ان چیزوں کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اسے اس امر کی آزادی دے دی گئی ہے کہ خدا کی طرف سے کسی جبر کے بغیر وہ خود ہی اپنی ذات پر اور اپنی ہر چیز پر خدا کے حقوق مالکانہ کو تسلیم کرنا چاہے تو کرے ورنہ آپ ہی اپنا مالک بن بیٹھے اور اپنے زعم میں یہ خیال کرے کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے حدود اختیار میں اپنے حسب منشا تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے بیع کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دراصل یہ بیع اس معنی میں نہیں ہے کہ جو چیز انسان کی ہے خدا اسے خریدنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس معاملے کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ جو چیز خدا کی ہے' اور جسے اس نے امانت کے طور پر انسان کے حوالے کیا ہے' اور جس میں امین رہنے یا خائن بن جانے کی آزادی اس نے انسان کو دے رکھی ہے' اس

کے بارے میں وہ انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو برضا و رغبت (نہ کہ بہ مجبوری) میری چیز کو میری ہی چیز مان لے' اور زندگی بھر اس میں خودمختار مالک کی حیثیت سے نہیں بلکہ امین ہونے کی حیثیت سے تصرف کرنا قبول کر لے' اور خیانت کی جو آزادی تجھے میں نے دی ہے اس سے خودبخود دست بردار ہو جا۔ اس طرح اگر تو دنیا کی موجودہ عارضی زندگی میں اپنی خودمختاری کو (جو تیری حاصل کردہ نہیں بلکہ میری عطا کردہ ہے) میرے ہاتھ فروخت کر دے گا تو میں تجھے بعد کی جاودانی زندگی میں اس کی قیمت بصورت جنت ادا کروں گا۔ جو انسان خدا کے ساتھ بیع کا یہ معاملہ طے کر لے وہ مومن ہے اور ایمان دراصل اسی بیع کا دوسرا نام ہے' اور جو شخص اس سے انکار کر دے' یا اقرار کرنے کے باوجود ایسا رویہ اختیار کرے جو بیع نہ کرنے کی صورت ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے' وہ کافر ہے اور اس بیع ہی سے گریز کا اصطلاحی نام کفر ہے۔

بیع کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس کے تضمنات کا تجزیہ کیجیے:

۱۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو بہت بڑی آزمایشوں میں ڈالا ہے۔ پہلی آزمایش اس امر کی کہ آزاد چھوڑ دیے جانے پر یہ اتنی شرافت دکھاتا ہے یا نہیں کہ مالک ہی کو مالک سمجھے اور نمک حرامی و بغاوت پر نہ اتر آئے۔ دوسری آزمایش اس امر کی کہ یہ اپنے خدا پر اتنا اعتماد کرتا ہے یا نہیں کہ جو قیمت آج نقد نہیں مل رہی ہے بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں جس کے ادا کرنے کا خدا کی طرف سے وعدہ ہے' اس کے عوض اپنی آج کی خودمختاری اور اس کے مزے بیچ دینے پر بخوشی راضی ہو جائے۔

۲۔ دنیا میں جس فقہی قانون پر اسلامی سوسائٹی بنتی ہے اس کی رو سے تو ایمان بس چند عقائد کے اقرار کا نام ہے جس کے بعد کوئی قاضی شرع کسی کے غیرمومن یا خارج از ملت ہونے کا حکم نہیں لگا سکتا جب تک اس امر کا کوئی صریح ثبوت اسے نہ مل جائے کہ وہ اپنے اقرار میں جھوٹا ہے۔ لیکن خدا کے ہاں جو ایمان معتبر ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ خیال اور عمل دونوں میں اپنی آزادی و خودمختاری کو خدا کے ہاتھ بیچ دے اور اس کے حق میں اپنے ادعائے ملکیت سے کلیتاً دست بردار ہو جائے۔ پس اگر کوئی شخص کلمہ اسلام کا اقرار کرتا ہو اور صوم و صلوٰۃ وغیرہ احکام کا بھی پابند ہو لیکن اپنے جسم و جان کا' اپنے دل و دماغ اور بدن کی قوتوں کا' اپنے مال اور وسائل و ذرائع کا' اور اپنے قبضہ و اختیار کی ساری چیزوں کا مالک اپنے آپ ہی کو سمجھتا ہو' اور ان میں اپنے حسب منشا تصرف کرنے کی آزادی اپنے لیے محفوظ رکھتا ہو' تو ہو سکتا ہے کہ دنیا میں وہ مومن سمجھا جاتا رہے مگر خدا کے ہاں یقیناً وہ غیرمومن ہی قرار پائے گا کیونکہ اس نے خدا کے ساتھ وہ بیع کا معاملہ سرے سے کیا ہی نہیں جو قرآن کی رو سے ایمان کی اصل حقیقت ہے۔ جہاں خدا کی مرضی ہو' وہاں جان و مال کھپانے سے دریغ کرنا اور جہاں اس کی مرضی نہ ہو وہاں جان و مال کھپانا' یہ دونوں طرز عمل ایسے ہیں جو اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں کہ مدعی ایمان نے یا تو جان و مال

کو خدا کے ہاتھ بیچا نہیں ہے' یا بیع کا معاہدہ کر لینے کے بعد بھی وہ بیچی ہوئی چیز کو بدستور اپنی سمجھ رہا ہے۔

۳۔ ایمان کی یہ حقیقت اسلامی رویۂ زندگی اور کافرانہ رویۂ زندگی کو شروع سے آخر تک بالکل ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ مسلم جو صحیح معنی میں خدا پر ایمان لایا ہو' اپنی زندگی کے ہر شعبے میں خدا کی مرضی کا تابع بن کر کام کرتا ہے اور اس کے رویہ میں کسی جگہ بھی خودمختاری کا رنگ نہیں آنے پاتا۔ الا یہ کہ عارضی طور پر کسی وقت اس پر غفلت طاری ہو جائے اور وہ خدا کے ساتھ اپنے معاہدۂ بیع کو بھول کر کوئی خود مختارانہ حرکت کر بیٹھے۔ اسی طرح جو گروہ' اہل ایمان سے مرکب ہو' وہ اجتماعی طور پر بھی کوئی پالیسی' کوئی سیاست' کوئی طرز تمدن و تہذیب' کوئی طریق معیشت و معاشرت اور کوئی بین الاقوامی رویہ خدا کی مرضی اور اس کے قانون شرعی کی پابندی سے آزاد ہو کر اختیار نہیں کر سکتا اور اگر کسی عارضی غفلت کی بنا پر اختیار کر بھی جائے تو جس وقت اسے تنبہ ہو گا اسی وقت وہ آزادی کا رویہ چھوڑ کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئے گا۔ خدا سے آزاد ہو کر کام کرنا اور اپنے نفس و متعلقات نفس کے بارے میں خود یہ فیصلہ کرنا کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں' بہرحال ایک کافرانہ رویۂ زندگی ہے' خواہ اس پر چلنے والے لوگ "مسلمان" کے نام سے موسوم ہوں یا "غیر مسلم" کے نام سے۔

۴۔ اس بیع کی رو سے خدا کی جس مرضی کا اتباع آدمی پر لازم آتا ہے وہ آدمی کی اپنی تجویز کردہ مرضی نہیں بلکہ وہ مرضی ہے جو خدا خود بتائے۔ اپنے آپ کسی چیز کو خدا کی مرضی ٹھیرا لینا' اور اس کا اتباع کرنا خدا کی مرضی کا نہیں بلکہ اپنی ہی مرضی کا اتباع ہے اور یہ معاہدۂ بیع کے قطعی خلاف ہے۔ خدا کے ساتھ اپنے معاہدۂ بیع پر صرف وہی شخص اور وہی گروہ قائم سمجھا جائے گا جو اپنا پورا رویۂ زندگی خدا کی کتاب اور اس کے پیغمبر کی ہدایت سے اخذ کرتا ہو۔

یہ اس بیع کے تضمنات ہیں' اور ان کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی خودبخود سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس خرید و فروخت کے معاملے میں بھی قیمت (یعنی جنت) کو موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمے پر کیوں مؤخر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت صرف اس اقرار کا معاوضہ نہیں ہے کہ "بائع نے اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ بیچ دیا"۔ بلکہ وہ اس عمل کا معاوضہ ہے کہ "بائع اپنی دنیوی زندگی میں اس بیچی ہوئی چیز پر خودمختارانہ تصرف چھوڑ دے اور خدا کا امین بن کر اس کی مرضی کے مطابق تصرف کرے"۔ لہٰذا یہ فروخت مکمل ہی اس وقت ہو گی جب کہ بائع کی دنیوی زندگی ختم ہو جائے اور فی الواقع یہ ثابت ہو کہ اس نے معاہدۂ بیع کرنے کے بعد سے اپنی دنیوی زندگی کے آخری لمحے تک بیع کی شرائط پوری کی ہیں۔ اس سے پہلے وہ ازروے انصاف قیمت پانے کا مستحق نہیں ہو سکتا (تفہیم القرآن' ج ۲' ص ۲۳۶-۲۳۷)۔

ذہنی دباؤ کا شکار ہونے سے بچیں

کام کا دباؤ شخصیت کو متاثر کرتا ہے۔ ذہن الجھتا ہے تو سماعت اور بصارت کی معمول کی صلاحیت بھی صحیح طرح کام نہیں کرتی۔ قلب پریشان ہو تو فیصلے غلط ہو جاتے ہیں۔

درج ذیل تدابیر کے ذریعے سے ذہنی تناؤ کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور دباؤ کی وجہ سے بہتر انداز میں کام کرنے کی صلاحیت کھونے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

① ہر گھنٹہ میں دو تین منٹ کے لیے اپنے دل کو ذکر اور درود کے لیے خاموشی سے وقف کر دیجیے۔ بظاہر اپنے کاموں کو جاری رکھیں۔ اس طرح اندرونی طور پر آپ سکینت اور توکل سے لبریز ہو جائیں گے۔ اگر آپ کی گھڑی گھنٹے پر آواز دیتی ہو تو اس طرح یاد دہانی ہو سکتی ہے۔

② افراد سے بے نیاز ہو جائیں' ان کے ساتھ احسان کریں اور بھول جائیں۔

③ کسی مقصد کے حصول کے لیے مشکل کے بجائے آسان راستے کا انتخاب کریں۔ نئے راستوں سے خائف نہ ہوں۔ سوچ کو تبدیل کرنے کے لیے آمادہ رہیں۔

④ خوف' محرومی' زیادتی' تکلیف' کینہ' کدورت' رنج' دکھ' حسد' غصہ' نفرت' دشمنی' جیسے جذبات کو حاوی نہ ہونے دیں۔ منفی کے بجائے مثبت رخ سامنے رکھیں۔ جذباتی طور پر پراگندگی سے بچیں۔

⑤ مسکراہٹ' مزاح' تفریح سے ذہن کو تازگی بخشیں۔ نیند ضروری ہوتی ہے۔ غذا ہلکی رکھیں۔ زندگی کو کثرت آسائش سے بوجھل نہ بنائیں۔

⑥ ہر صبح نیا آغاز کریں۔ گزرے ہوئے کل کے بجائے آنے والے کل پر نظر رکھیں۔ فطرت کے حسین مظاہر سے لطف اندوز ہونے کے مواقع کا اہتمام کریں۔

⑦ خاندان کے درمیان وقت کو یکسوئی کے ساتھ خاندان کے دائرے ہی میں توجہ کرتے ہوئے گزاریں۔ باہر کے مسائل اندر نہ لائیں۔

کلام نبویؐ کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

نعیم بن قعنب ریاحی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابوذرؓ سے ملنے گیا۔ وہ خود موجود نہ تھے' ان کی اہلیہ گھر پر تھیں۔ ان سے پوچھا کہ حضرت ابوذرؓ کہاں ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: وہ دیکھو اپنے اونٹوں کے ساتھ آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ اپنے دو اونٹوں کو قطار میں لیے آپہنچے۔ دونوں کی گردنوں میں پانی کے مشکیزے لٹک رہے تھے۔ انھیں اتار کر زمین پر رکھا۔ ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا: مجھے آپ کی ملاقات سے زیادہ کسی کی ملاقات محبوب نہ تھی' اور آپ کی ملاقات سے زیادہ کسی کی ملاقات ناپسند بھی نہ تھی۔ یہ سن کر انھوں نے حیرت کا اظہار کیا اور فرمایا: دو متضاد باتوں کا اجتماع کیسے ہو گیا؟ میں نے کہا: میری ایک مشکل تھی کہ میں نے دور جاہلیت میں ایک بچی کو زندہ درگور کرنے کا جرم عظیم کیا تھا۔ اب میں توبہ اور نجات کے بارے میں امید و بیم کی حالت میں ہوں۔ ملاقات اس لیے محبوب تھی کہ توبہ اور نجات کے بارے میں آپ سے پتا چل جائے (تو بے انتہا خوشی ہو گی) اور ناپسند اس لیے کہ آپ سے ملنے کے بعد اگر معلوم ہوا کہ توبہ اور نجات نہیں ہے تو جو تھوڑی بہت امید تھی' وہ بھی ختم ہو جائے گی (اور پریشانی ہو گی)۔ انھوں نے پوچھا: کیا یہ کام جاہلیت میں کیا تھا؟ میں نے کہا: ہاں! انھوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان گناہوں کو معاف کر دیا ہے جو اسلام سے پہلے جاہلیت میں ہو گئے ہوں۔

اس کے بعد حضرت ابوذرؓ نے گھر کے اندر اہلیہ کی طرف اپنا سر جھکایا اور میرے لیے کھانا لانے کا حکم دیا جس پر انھوں نے کوئی پروا نہ کی۔ دوبارہ کہا تو انھوں نے پھر وہی رویہ اختیار کیا۔ اس پر تلخ کلامی ہوئی اور دونوں کی آوازیں اونچی ہو گئیں۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا: اچھا تو پھر خاموش رہو' اور اپنی مرضی کرو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تمھارے بارے میں فرمایا ہے تم اس سے اِدھر اُدھر نہیں جا سکتیں۔ میں نے پوچھا: رسولؐ اللہ نے ان کے بارے میں کیا فرمایا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ عورت ایک پسلی کی طرح ہے۔ اگر اسے زور سے سیدھا کرو گے تو اسے توڑ دو گے اور اگر سختی سے پیش نہ آؤ گے تو پھر اس سے مطلوب ملے گا' اس حالت میں کہ اس میں کسی درجے میں کجی باقی ہو گی۔ یہ

سن کر وہ چلی گئیں اور کبوتر کے گوشت کی طرح کا لذیذ کھانا لے آئیں۔ حضرت ابوذرؓ نے مجھے فرمایا' کھانا کھائیں اور میرے بارے میں فکرمند نہ ہوں' میں روزے سے ہوں۔ یہ کہہ کر نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے' رکوع بہت شائستگی سے لیکن مختصر کیے (میں نے کھانا شروع کر دیا)۔ میں نے دیکھا کہ وہ اس کوشش میں ہیں کہ میں سیر ہو کر کھالوں یا سیر ہونے کے قریب ہو جاؤں (جب انھیں اندازہ ہو گیا کہ میرا گزارا ہو گیا ہے) تب وہ آگئے اور میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے۔ میں نے اس پر اناللّٰہ وانا الیہ راجعون پڑھا تو کہنے لگے: کیا بات ہے؟ میں نے کہا: دوسرے لوگوں سے تو مجھے ڈر ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے جھوٹ بولیں گے لیکن آپ سے تو یہ اندیشہ نہ تھا۔ انھوں نے فرمایا: اللہ تیرا بھلا کرے۔ جب سے آپ آئے ہیں' میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے کہا: کیا آپ نے مجھ سے فرمایا نہیں تھا کہ آپ روزے سے ہیں اور اب میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کھانا کھا رہے ہیں! انھوں نے فرمایا: ہاں! سچ ہے کہ میں روزہ دار ہوں۔ اس لیے کہ میں نے اس مہینے کے تین دن روزے رکھے ہیں۔ پس پورے مہینے کے روزوں کا اجر آج کے دن سمیت میرے لیے (ان شاء اللہ) ثبت ہو گیا ہے اور میرے لیے آپ کے ساتھ کھانا جائز ہو گیا" (الفتح الربانی' ج ۱۶' ص ۲۳۵)۔

اس طویل حدیث میں بہت سی باتیں سیکھنے کی ہیں:

جب حضرت ابوذرؓ کی اہلیہ نے مہمان کے لیے کھانا لانے میں لیت و لعل سے کام لیا' تو حضرت ابوذرؓ نے انھیں اس کے سوا کچھ نہیں کہا کہ کھانا نہیں لانا تو پھر خاموشی سے اپنا کام کریں اور انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک سنا دی۔ اس پر اہلیہ کے دل میں نرمی پیدا ہو گئی اور وہ اپنی مرضی سے بہترین کھانا لے آئیں۔

حضرت ابوذرؓ کا حدیث پر عمل' اہلیہ کا حدیث سن کر اپنا رویہ بدل لینا' اگر اس طرح ہم اپنے گھروں میں رسولؐ اللہ کے فرمودات سن کر ہی نہ رہ جائیں بلکہ ان کے مطابق اپنے کو ڈھال لیں' تو زندگی کتنی اچھی ہو جائے گی۔

حضرت ابوذرؓ نے مہمان کو سیر ہو کر کھلانے کی خاطر' تین دن کے روزے سے مہینے بھر کے روزہ دار ہونے کی رعایت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ یہ معاملات میں ظرافت طبع کی بھی مثال ہے۔

یہ بات غور کرنے کی ہے کہ گھر میں اتنا کھانا نہیں کہ مہمان اور صاحب خانہ ساتھ بیٹھ کر کھالیں (ہماری دعوتوں میں کتنا ضائع کیا جاتا ہے!)

صحابہ کرامؓ میں یہ صفت بدرجہ اتم پائی جاتی تھی جس کی ایک مثال حضرت ابوذرؓ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ ارشاد پر عمل ہے کہ غصہ کی حالت میں بھی' نفسانی جذبات کو حدیث رسولؐ کے تابع کر دیا اور بردباری سے کام لیا۔

صحابہ کرامؓ مسائل پوچھنے کے لیے آنے والے لوگوں کو جواب دے کر ان کی تشفی بھی کرتے اور ان کے ساتھ حسن اخلاق سے بھی پیش آتے۔ سائلین کی مہمان نوازی بھی کرتے تھے اور ان کے لیے زندگی کے مختلف

شعبوں میں اپنی سیرت و کردار سے عملی نمونے بھی پیش کرتے تھے۔
حضرت ابوذرؓ نے نعیم بن قعنب ریاحی کے سامنے اپنے اہل خانہ کے ساتھ شفقت سے پیش آنے کی قولی تعلیم کے ساتھ اس کا عملی نمونہ بھی پیش کر دیا۔

O

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جب تم میں سے کوئی آدمی ایک بات کو حق سمجھتا ہو' اس نے اس کا مشاہدہ کیا ہو یا بذات خود سنا ہو تو لوگوں کا رعب اسے حق بات کہنے سے نہ روکے (الفتح الربانی' ج ۱۵' ص ۲۲۱)۔
اس لیے کہ اصل رعب تو اللہ کا ہے' لوگوں کا نہیں۔

O

حضرت معاذ بن انس جہنیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کون سا جہاد افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جس میں اللہ کی یاد زیادہ ہو۔ پھر پوچھا: کون سا روزہ دار افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جو اللہ کو زیادہ یاد کرتا ہو۔ پھر نماز' زکوٰۃ' حج اور صدقے کے بارے میں یہی سوال کیا تو آپؐ نے ہر ایک سوال کا یہی جواب دیا کہ جس میں اللہ کی یاد زیادہ ہو وہ افضل ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ابوحفصؓ! (حضرت عمرؓ کو مخاطب کیا) اللہ کی یاد کرنے والے تو ساری بھلائیاں سمیٹ کر لے گئے۔ یہ سن کر رسول اللہ نے فرمایا: "ہاں" (الفتح الربانی' ج ۱۴' ص ۲۰۳)۔
اللہ تعالیٰ کی یاد' اس کی شان اور نعمتوں' حقوق اور احکام کا استحضار ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو بندگی کی راہ پر قائم رکھتی اور چلاتی ہے۔ یہ اعمال کی روح ہے۔ اگر ایک شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کو نظرانداز کرتا ہے تو وہ زبان سے ذکر کرنے کے باوجود اللہ کی یاد سے غافل ہے' وہ ذاکر شمار نہ ہوگا۔

O

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جب بیت اللہ شریف کا حج کر کے واپس آنے والے سے ملاقات ہو تو اسے سلام کہو' مصافحہ کرو اور اس سے درخواست کرو کہ وہ تمھارے لیے گھر میں داخل ہونے سے پہلے استغفار کرے' کہ اس کے گناہ تو معاف کر دیے گئے ہیں (الفتح الربانی' ج ۱۳' ص ۲۷)۔
دعا کرنا عبادت ہے۔ آدمی خود اپنے لیے دعا کرے اور دوسروں سے بھی دعا کرائے' خصوصاً نیک لوگوں سے اور ان لوگوں سے جو کوئی نیک کام کر کے آئے ہوں۔ جو لوگ نیک کام کرتے ہیں' وہ اللہ کی بات مانتے ہیں' وہ اللہ کو پکاریں گے تو اللہ بھی ان کی بات سنیں گے۔ حج کر کے واپس آنے والے نے اللہ تعالیٰ کو لبیک کہا' اب جب

وہ اللہ سے مانگے گا تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بڑھ کر اس کی پکار کا جواب دیں گے۔ اس لیے حجاج کرام اور مجاہدین سے دعا کرانا قبولیت دعا کا ذریعہ ہے۔

○

حضرت جابر بن عتیکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایک غیرت وہ ہے جسے اللہ پسند کرتا ہے' اور ایک وہ ہے جسے اللہ ناپسند کرتا ہے۔ اسی طرح ایک تکبر وہ ہے جسے اللہ پسند کرتا ہے' اور ایک وہ ہے جسے اللہ ناپسند کرتا ہے۔ وہ غیرت جسے اللہ پسند کرتا ہے وہ ہے جو اس وقت پیدا ہو جب کوئی ناجائز اور حرام کام کا مرتکب ہو۔ وہ غیرت جسے اللہ ناپسند کرتا ہے وہ ہے جو اس آدمی کے خلاف پیدا ہو جو جائز کام کرتا ہے۔ وہ تکبر جو اللہ کو پسند ہے وہ ہے جو اللہ کی خاطر لڑائی اور اس کی راہ میں صدقہ کے وقت پیدا ہو' اور وہ تکبر جسے اللہ ناپسند کرتا ہے وہ ہے جو محض حسب و نسب' مال و دولت اور قابلیت و صلاحیت پر ہو (الفتح الربانی' ج ۱۳' ص ۵۷)۔

اللہ کے دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جانا' اسے پسپا کرنا' اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو۔ اسی طرح اللہ کی راہ میں صدقہ کر کے خوش ہونا' اور بڑے کام کر گزرنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اسے حدیث میں تکبر سے تعبیر کیا گیا جو حقیقت میں تکبر نہیں ہے۔ حقیقت میں تکبر اللہ کے مقابلے میں بڑا بننا' اس کے احکام کا مقابلہ کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔ محض بڑا ہونے یا بڑا کام کرنے کا احساس تکبر نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ سخی آدمی اپنے آپ کو بخیل کے مقابلے میں اچھا سمجھے گا اور بڑا خیال کرے گا' تب ہی سخاوت کرے گا اور بخل سے بچے گا۔

جن کاموں کو اللہ نے ناجائز قرار دیا ہے ان سے خود اجتناب کرنا اور دوسرے لوگوں کو روکنا' ایمانی غیرت و حمیت کا تقاضا ہے۔ لیکن جو کام شرعاً جائز ہوں' ان کے خلاف غیرت کھانا جاہلیت ہے۔ اسی طرح خاندان' نسل و نسب اور خداداد صلاحیتیں' قابلیتیں اور کمالات موجب فخر نہیں ہیں۔ ایک انسان کے لیے اگر کوئی چیز قابل فخر ہے تو وہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جان و مال سے جہاد اور اللہ کی بندگی کے کام ہیں۔ یعنی انسان سمجھ سکتا ہے کہ اللہ کے ہاں یہ چیزیں بڑائی کا ذریعہ ہیں۔ لیکن ان چیزوں کو بھی انسان اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرے اور لوگوں کے ساتھ متکبرانہ رویہ اختیار نہ کرے۔ کسی کو کیا پتا ہے کہ اس کا جہاد اور نیکی قبولیت پا چکی ہے اور وہ اللہ کے ہاں بڑے لوگوں میں شامل ہو گیا ہے۔

یہ حدیث تقاضا کرتی ہے کہ انسان باطل کے سامنے دبنے' جھکنے اور خوف کھانے کی بیماری سے بچے کہ اللہ تعالیٰ کو باطل کے مقابلے میں کھڑا رہنا اور مقابلہ کرنا پسند ہے۔ اہل باطل کے مقابلے میں اہل حق کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا تکبر نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اہل باطل کے مقابلے میں بڑا بنایا ہے: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آل عمرٰن ۳:۱۳۹) تم ہی بڑے ہو اگر تم ایمان والے ہو۔

حج کا پیغام

خرم مرادؒ

مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں پہلا وہ گھر خدا کا' جس کے گرد ان دنوں عشاق بے تاب کا ایک ہجوم بے پناہ دنیا کے گوشے گوشے سے کھنچ کھنچ کر پروانہ وار جمع ہو رہا ہے' اور ہزاروں برس سے ہوتا چلا آ رہا ہے' ہمارے لیے مرکز زندگی کا مقام رکھتا ہے۔ اس گھر کی غریب و سادہ و رنگین داستان کے ورق ورق پر آیات بینات کا ایک اتھاہ خزانہ رقم ہے۔ ان آیات میں دیدہ و دل وا کرنے کے لیے' راہ زندگی روشن کرنے کے لیے' اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے' بیش بہا دولت محفوظ ہے۔ اس گھر میں وہ زم زم ہی رواں نہیں ہے جو چار ہزار سال سے پیاسوں کی پیاس بجھا رہا ہے اور بجھاتا چلا جائے گا' بلکہ اسی سے ہدایت و برکت کا وہ زم زم بھی جاری ہوا ہے جس نے سارے جہانوں کی معنوی تشنگی دور کرنے اور ان کے قلوب و ارواح اور فکر و عمل کی سیرابی کا سامان کیا ہے۔ اور کیوں نہ ہو' کہ اس ایک گوشۂ مکان کے حصے میں یہ سعادت آئی ہے کہ خدائے لامکاں کی رحمت کاملہ نے اسیر مکان و زمان کو اپنا تقرب بخشنے کی خاطر اسے اپنا گھر بنا لیا ہے: اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۝ فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ (ال عمران ۳:۹۶-۹۷)۔

ان آیات بینات میں سب سے نمایاں' اخلاص و محبت اور اطاعت و وفا کے وہ نقوش ہیں جو اس گھر کے ایک ایک پتھر پر' اور اس کے جوار میں ایک ایک چپے پر' سلسلۂ رشد و ہدایت کے امام اولیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے راہ خدا میں اپنے مقام عالی سے ثبت کیے ہیں۔ انھوں نے رب واحد کی بندگی کی خاطر وطن چھوڑنے کے بعد' اپنی یک و تنہا بیوی اور شیرخوار بیٹے کو اس گھر کے جوار میں لا بسایا' انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اس گھر کی دیواریں چنیں' انھوں نے اس گھر کی زیارت کے لیے مشرق و مغرب کو پکارا' انھوں نے اس گھر کو طواف' اعتکاف' قیام اور رکوع و سجود کا مرکز بنایا' یہیں انھوں نے بارگاہ محبوب میں اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی۔ انھوں نے ہی مشیت الٰہی کی طرف سے اس گھر کو سلسلۂ رشد و ہدایت کے امام آخر صلی اللہ علیہ وسلم' اور امت مسلمہ کے ظہور کا مبدا و مرکز بنانے کے فیصلے کو' دعا کے رنگ میں' ثبت و ظاہر

کر دیا۔

پھر اللہ کا یہ گھر' اور یہ البلد الامین ان تمام تابناک و بے مثال روایات کا حامل بھی بن گیا جو بعثت محمدیؐ ' نزول قرآن' دعوت اسلامی' اور ہجرت و جہاد کے ابواب میں محفوظ ہیں۔ اس گھر کا کوئی پتھر ایسا نہیں' اس کے قرب میں کوئی چٹان اور سنگریزہ ایسا نہیں' جس کے دل میں ہدایت و دعوت اور ہجرت و جہاد کا کوئی نہ کوئی نقش محفوظ نہ ہو' اور جویا و پیاسا اسے پا نہ سکتا ہو۔ سوچیے تو یہ بھی وراثت ابراہیمؑ ہی ہے: مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ط هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (الحج ۲۲:۷۸)۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس گھر کو' اور اس شہر کو ایسا جائے امن بنایا کہ جو اس میں داخل ہو جاتا ہے' اس کے جان و مال محفوظ ہو جاتے ہیں' اور ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ مگر انھوں نے اس گھر میں ہدایت کا جو مرکز قائم کیا' صرف وہ مرکز ہی ایک ایسا مرکز ہے جہاں انسان داخل ہو تو اس کے قلب و روح' فکر و سوچ' اخلاق و کردار' شخصی زندگی اور حیات اجتماعی' سب محفوظ و مامون ہو جاتے ہیں۔ اگر کہیں انسان خوف و حزن' ظلم و فساد' اور دنیا و آخرت کے بگاڑ اور تباہی سے امن حاصل کر سکتا ہے تو اس بنائے ہدایت میں داخل ہو کر جو عالم معنوی میں خانۂ کعبہ کی مثال ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (آل عمرٰن ۳:۹۷)۔

صراط مستقیم پر چلنے کے لیے یہ ضروری ہوا کہ جو پہنچ سکتا ہو وہ کم سے کم عمر میں ایک دفعہ' حضرت ابراہیمؑ کی طرح گھربار ترک کر کے' طویل مسافت طے کر کے' لباس دنیا اتار کے' اللہ کے اس گھر تک ضرور پہنچے' اور یہاں فیض کا جو چشمہ بہہ رہا ہے اس میں ضرور غوطہ لگائے۔ اس گھر پر وہ اپنے دل کا لنگر ڈال دے' اس کو نگاہوں میں بسا لے کہ اس کو دیکھنا بھی عبادت ہے' اس کے چاروں طرف چکر کاٹے' اس کے در و دیوار سے چمٹے' اس کے جوار میں پہاڑیوں پر چڑھے' وادیوں میں چلے اور رب البیت کے دربار عرفات میں حاضر ہو جائے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ط (آل عمرٰن ۳:۹۷)۔

لیکن نہ ہر شخص پہنچ جانے کی استطاعت رکھ سکتا ہے' نہ عمر میں صرف ایک دفعہ ہو آنا اس چشمۂ ہدایت سے فیض مطلوب حاصل کرنے کے لیے کفایت کرتا ہے۔ جو هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ہے اس کے ساتھ تو زندگی کا ہر لمحہ مربوط رہنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ یہ بھی ضروری ہوا کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی ہو' اور جس حالت میں بھی ہو' ہر روز پانچ دفعہ' دنیا کا ہر شغل اور ہر دلچسپی ترک کر کے (جس طرح حج کے لیے کرتے ہو)' اس برکت و ہدایت کے گھر کی طرف رخ کرو' سامنے اسی گھر کو رکھو' نگاہیں اسی پر جماؤ: وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ط (البقرہ ۲:۱۴۴)۔

بیت اللہ کے حج کو جانا' عمر بھر جانے کی آرزو اور شوق میں سلگتے رہنا' گویا کہ اس کو اپنی سعی و طلب کا مقصود بنانا' اور ہر روز پانچ دفعہ اس کی طرف رخ کر کے اپنے رب کے سامنے جھکنا اور بچھ جانا اور اس سے ہم کلام ہونا' گویا کہ اس کو اپنے دل و نگاہ کا مرکز بنانا' ایسے اعمال ہیں جو ہماری زندگیوں کو رخ' رنگ اور

ساخت عطا کرتے ہیں۔ ان دنوں جب حج کا موسم ہے اور زائرین اس شمع کے گرد ہجوم کر رہے ہیں' ہمیں آگاہ ہونا چاہیے کہ اس گھر میں' اس کی تاریخ میں' اس کی روایات میں' اس میں ثبت کردہ نقوش و آثار میں' برکت و ہدایت اور آیات بینات کے کیسے کیسے بیش بہا خزانے ہیں جو ہماری جستجو کے منتظر ہیں' اور جن سے ہمیں اپنی جھولی بھرنا چاہیے۔

بر و بحر میں فساد کا تلاطم ہو' ہمارے گھروں میں ظلم اور فتنہ کی طغیانی ہو' امت ذلت و مسکنت کے شکنجے میں کسی ہوئی ہو' اغیار کا غلبہ و تسلط ہو' باہمی افتراق و عداوت ہو' خون مسلم کی ارزانی اور عزت مسلم کی پامالی ہو تو سکھ اور چین کیسے نصیب ہو۔ ہر لمحہ اضطراب' ہر لمحہ بے چینی کیسے دور ہو۔ جس طرح بچے کو ماں کے سینے سے چمٹ کر ہی امن و اطمینان نصیب ہوتا ہے' انسانیت اور امت مسلمہ کو بھی امن اور فلاح' بیت اللہ کی دی ہوئی ہدایت سے چمٹ کر ہی نصیب ہو سکتی ہے۔

خدائے لامکاں کسی مکان میں سما نہیں سکتا۔ بیت اللہ تو ایک علامت ہے' ایک شعار ہے' اور اس لیے ہے کہ مرکز دل' محبوب نظر' مقصود سعی و جہد' اللہ اور صرف اللہ' بن جائے۔ جو اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھام لے' اسی کے ساتھ جڑ جائے' اس طرح تھام لے اور جڑ جائے جس طرح کہ اللہ کا حق ہے' وہی صراط مستقیم پا لیتا ہے: وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (آل عمران ۳:۱۰۱)۔ ہدایت کوئی لیبل چسپاں کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی' وہ یہودی کا لیبل ہو' نصرانی کا' یا محمدی کا۔ نہ ہدایت خانہ کعبہ کا چکر کاٹ آنے سے ملتی ہے' نہ اس کی طرف منہ کر لینے سے۔ ہدایت تو حضرت ابراہیمؑ کی طرح اللہ کا حنیف بندہ بن جانے کا نام ہے' جس میں شرک کی گندگی کا شائبہ تک بھی نہ ہو: بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ط وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (البقرہ ۲:۱۳۵)۔

حضرت ابراہیمؑ حنیف تھے۔ یعنی وہ سب کچھ چھوڑ کر صرف اللہ کے بن گئے تھے' اس کے ہو رہے تھے' اور اللہ کے سوا کسی کے نہ رہ گئے تھے۔

انھوں نے ہر ڈوبنے والی چیز کی' اور ماسوا اللہ ہر چیز ڈوبنے والی اور فنا ہونے والی ہے' محبت ترک کر کے' تمام چمکتے دمکتے چاند' سورج اور ستاروں کا طلسم توڑ کے' اپنا اور اپنی زندگی کا رخ صرف اللہ کی طرف کر لیا تھا' سب سے بڑھ کر صرف اس کی محبت اپنے دل میں بسا لی تھی' صرف اس کو طلب و سعی کا مرکز بنا لیا تھا' صرف اسی پر نگاہیں جما دی تھیں' یا یوں کہیے صرف اسی کو اپنی شخصیت اور زندگی کا قبلہ بنا لیا تھا' اور اس رخ میں' توجہ میں' وابستگی میں' اللہ کے علاوہ اور کوئی رخ نہ تھا جو شریک ہو۔

انھوں نے اپنا سب کچھ اپنے رب کے حوالے کر دیا تھا' اور کوئی چیز اس سے بچا کر نہ رکھی تھی--- اپنے علاقے اور محبتیں' اپنا گھر اور وطن' اپنی بیوی اور بیٹے' اپنی دنیا اور اپنی متاع--- پرستش بھی اس کی' ہر

چیز اس کے اشارے پر حاضر اور قربان بھی' زندگی بھی اسی کی' موت بھی اسی کی۔ اور اس خود سپردگی میں بھی شمہ برابر حصہ اللہ کے علاوہ اور کسی کے لیے نہ لگایا تھا۔

وہ اپنے رب کے ہر حکم کی فرماں برداری کے لیے ہروقت مستعد اور حاضر تھے۔ آگ میں بے خطر کود پڑنے کا حکم ہو' گھر اور وطن چھوڑ کر نکل جانے کا حکم ہو' باپ کے لیے استغفار تک ترک کر دینے کا حکم ہو' تمام معبودان باطل سے اعلان برأت و عداوت کا حکم ہو' اہل و عیال کو وادی غیرذی زرع میں بسانے کا حکم ہو' پتھروں سے اللہ کے گھر کی دیواریں چننے کا حکم ہو' اکلوتے اور محبوب نور نظر کے گلے پر چھری چلانے کا حکم ہو۔ ان کی زبان پر ہروقت لبیک تھا' وہ ہروقت حاضر تھے' ان کی ہر چیز حاضر تھی۔

توحید خالص' ریاضی کے فارمولے کی طرح' اللہ کو ایک مان لینا نہیں' بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح سب کچھ چھوڑ کر صرف اسی کا بن جانا اور اسی کا ہو کر رہنا ہے۔ بیت اللہ کی آیات ہدایت میں سب سے نمایاں اور سب سے اہم حضرت ابراہیمؑ کا یہی اسوۂ بندگی ہے جو "اسلام" اور حنیفیت سے عبارت ہے۔ حج اور استقبال قبلہ کا عمل ہمیں بندگی رب کے اس رنگ میں رنگنے ہی کے لیے ہے' جس کی شان حضرت ابراہیمؑ اور آل ابراہیمؑ نے اپنی توحید خالص' اخلاص و وفاداری' فرماں برداری اور یکسوئی سے قائم کی۔ یہی رنگ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے' یہی اس کو مطلوب ہے' یہی اس کے ہاں مقبول ہے۔ اس رنگ میں رنگ جانے والوں ہی سے وہ راضی ہوتا ہے۔ انھی سے دنیا میں علو و امامت کا وعدہ ہے' اور آخرت میں جنت کے انعام سے سرفرازی کا۔

ہم حج بھی کریں' عمروں کے لیے بھی جائیں' منہ کعبہ شریف کی طرف کر کے نمازیں بھی پڑھیں' مگر ہم پر وہ رنگ نہ چڑھے جو حضرت ابراہیمؑ کا رنگ تھا' تو اس سے بڑھ کر ہماری حرماں نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے' اور جو حرماں نصیبی ہمارا مقدر بن گئی ہے اس کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہم سے دنیا میں جو وعدے ہیں--- استخلاف فی الارض کا وعدہ ہے' غلبہ دین کا وعدہ ہے' خوف سے نجات اور امن سے ہم کنار کرنے کا وعدہ ہے--- وہ سب وعدے اس شرط کے ساتھ مشروط ہیں کہ ہم اللہ کے ایسے بندے بن جائیں کہ بندگی اور کسی کے لیے نہ ہو: يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (النور ۲۴:۵۵)۔

مشرق سے لے کر مغرب تک نظر ڈال لیجیے! کیا امت مسلمہ میں حضرت ابراہیمؑ کا کوئی ایسا رنگ ہے جو غیر مسلموں اور مشرکوں کے رنگ سے الگ ہو۔ اپنے دلوں کو دیکھیے' انھی کی طرح بے شمار ٹکڑوں میں منقسم ہیں اور ہر ٹکڑے میں ایک الگ معبود بیٹھا ہوا ہے۔ اغراض و مقاصد پر نظر ڈالیے' انھی کی طرح وہ بھی ان گنت ہیں اور ان میں سب سے کم مقام ان کا ہے جو اللہ کے نزدیک محبوب ترین ہیں۔ نماز میں بے شک ہمارا منہ قبلہ کے علاوہ کسی اور طرف نہیں ہوتا' لیکن زندگی میں تو انھی کی طرح ہمارے بہت سے قبلے ہیں جو ہماری توجہات اور وابستگیوں کا مرکز ہیں۔ زبان پر بے شک لبیک ہے' لیکن ہم نہ خود اپنے کو' نہ اپنی

کسی محبوب چیز کو' اللہ کے لیے حاضر کرنے کو تیار ہیں۔ ہر حکم کی تعمیل میں ہماری اپنی کسی نہ کسی خواہش' پسند و ناپسند' محبوب و مبغوض کی قربانی دامن گیر ہو جاتی ہے' یا ہزاروں اندیشے اور خوف ہمیں چاروں طرف سے گھیر کر ہماری راہ مسدود کر دیتے ہیں۔ حج ہو یا استقبال قبلہ' بے جان مراسم عبادت نہ ہمارے قلوب کو بیدار کرتے ہیں' نہ نگاہوں میں پاکیزگی و یکسوئی پیدا کرتے ہیں' نہ عمل میں صالحیت۔ یہ نہ ہماری سوچ بدلتے ہیں' نہ شخصیت' نہ زندگی۔

بیت اللہ کی آیات بینات میں سے یہ بھی ہے کہ ہمہ اقتدار و ہمہ اختیار حی و قیوم خدا' جو آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کا بلاشرکت غیرے مالک کل ہے' اور جس کی کرسی اقتدار سب کو سمیٹے ہوئے ہے' وہ جب چاہے موت کو زندگی سے' زندگی کو موت سے' اندھیروں کو روشنی سے' روشنی کو اندھیروں سے' عزت کو ذلت سے' اور ذلت کو عزت سے' بدل دیتا ہے۔ جو اس کے ساتھ ایمان اور بندگی کا رشتہ قائم کر لے' اسے ہر اندیشہ اور خوف سے' ہر حزن و غم سے' ہر حسرت و یاس سے پاک ہونا چاہیے۔

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ جب حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ کو مکہ میں بسانے کے لیے آئے تو وہاں نہ انسان کا نام و نشان تھا' نہ پانی کا' نہ زراعت کا' نہ خورد و نوش کا کوئی انتظام' ایک تھیلی (جراب) کھجوروں کی' اور ایک مشکیزہ پانی کا' بس یہ کل کائنات تھی جو وہ ان کے پاس چھوڑ کر چلے۔ حضرت ہاجرہؑ نے بار بار پوچھا کہ ہمیں ایسی وادی میں چھوڑ کر آپ کہاں چلے' جہاں نہ آدم نہ آدم زاد' نہ کوئی اور چیز۔ کوئی جواب نہ پایا تو سوال کیا' کیا اس کا حکم آپ کو اللہ نے دیا ہے؟ فرمایا' ہاں۔ یہ سن کر وہ اطمینان و سکون اور امن کی اس جنت میں داخل ہو گئیں' جس کا باغ ان کے اندر لہلہا اٹھا۔ یہ جنت کیا تھی؟ فرمایا' اِذَنْ لاَ یُضَیِّعُنَا (پھر تو وہ ہم کو ضائع نہ کرے گا)۔ بخاری کی ایک دوسری روایت کے مطابق' حضرت ہاجرہؑ کے پوچھنے پر کہ ہمیں کس پر چھوڑ کر جا رہے ہو' حضرت ابراہیمؑ نے کہا' اللہ پر۔ یہ سن کر وہ پورے سکون و اطمینان سے بولیں' رَضِیْتُ بِاللّٰہِ (میں اللہ پر راضی ہوں)۔

اللہ پر یقین اور اعتماد' اللہ پر بھروسہ اور توکل' اللہ کے ہر فیصلے پر خوش' بندگی رب کی یہ کیفیت تھی کہ ایک یکہ و تنہا عورت اپنے شیرخوار بچے کے ساتھ' پتھریلے بیابان میں' بھیانک اور ڈراؤنی راتیں' تپتے ہوئے دن' موذی جانور' چور اور ڈاکو' سب کے باوجود' اطمینان اور امن کی کیفیت سے مالا مال تھی۔ معاش کا بندوبست بھی کھجوروں کی ایک تھیلی اور پانی کے ایک مشکیزے سے زائد کچھ نہ تھا۔ پھر بیت اللہ کی تاریخ گواہ ہے کہ جہاں کوئی وسائل نہ تھے' کوئی اسباب نہ تھے' کوئی سہارا نہ تھا' صرف خطرات ہی خطرات تھے' وہاں خدائے حی و قیوم چار ہزار سال سے سب کچھ بخش رہا ہے۔ جہاں کوئی انسان نہ تھا' وہاں لاکھوں انسان

دنیا بھر سے چلے آرہے ہیں۔ جہاں نہ پانی تھا' نہ کھانا' وہاں ہر قسم کا خوردونوش کا سامان پایا جاتا ہے۔
یہ علم ہو جانے کے بعد' پیغمبر کی زبان سے کہ جس کا علم غیر مشتبہ ہے' کہ یہ خدا کا حکم ہے' کچھ مادی وسائل نہ ہونے کے باوجود' دنیا بھر میں یکہ و تنہا ہونے کے باوجود' ہر قسم کے سنگین اور مہیب خطرات اور اندیشوں کے سامنے ہوتے ہوئے' اطاعت و فرماں برداری کی راہ چل پڑنا ہی حکمت و دانائی کا راستہ ہے۔ یہی حکمت و دانائی راسخ ہونا چاہیے' اس میں جو چشم سر سے بیت اللہ کو دیکھے' اور پانچ وقت اس کی طرف رخ کرے۔ کیا ہم اغیار کے علم و حکمت سے جھولیاں بھرنے کے بعد' اپنی اس سب سے بیش بہا متاع حکمت کو کھو نہیں بیٹھے ہیں؟

حج کے تقریباً سارے ارکان' سعی' جہد اور حرکت پر مشتمل ہیں۔ گھر سے نکلنا' سفر کرنا' بیت اللہ کے گرد طواف کرنا' صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا' مکہ سے نکل کر منیٰ میں ڈیرے ڈالنا' اگلے دن ہی وہاں سے کوچ کر دینا اور عرفات میں جمع ہو جانا' مغرب ہوتے ہی عرفات سے چل دینا' رات کی چند گھڑیاں مزدلفہ میں گزار کے صبح ہی صبح منیٰ واپس پہنچ جانا' پھر مکہ جا کر طواف اور سعی کرنا۔
بندگی رب کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ اللہ کے ہر حکم اور پکار پر لبیک کہنا' سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کھڑے ہو جانا' جو کچھ بھی میسر ہو اور جس حالت میں بھی ہو' تعمیل حکم کے لیے نکل پڑنا' اپنی طرف سے کوشش اور جہد میں کوئی کسر نہ چھوڑنا' وسائل زیادہ سے زیادہ جمع کرنا اور ہر ممکن بہتر سے بہتر تدبیر کرنا مگر بھروسہ اور نظر صرف تدبیر رب پر رکھنا' اور جو کچھ کرنا صرف رب کے لیے کرنا۔
حج میں سارے اعمال' ان صفات کے راسخ کرنے ہی کا کام نہیں کرتے' بلکہ ان اعمال میں حضرت ابراہیمؑ کا اسوہ کامل بھی برابر تازہ کرتے ہیں' اور اسے نگاہوں کے سامنے لاتے ہیں۔ پتھر کے ایک معمولی سے گھر کو یہ مقام' قبولیت' محبوبیت اور مرجعیت حاصل ہوئی تو اس میں اس مشن کو بھی دخل تھا جس کے لیے انھوں نے یہ گھر تعمیر کیا اور یہاں اپنی ذریت کو بسایا' اور اخلاص نیت و عمل کو بھی۔ مکان بنوانے والے نے آغاز ہی میں ہدایت کر دی تھی کہ "میری بندگی میں کسی کو شریک نہ بنانا" (الحج ۲۲:۲۶)۔ اور "میرے گھر کو طواف و اعتکاف اور رکوع و سجود کے لیے پاک و آباد رکھنا" (البقرہ ۲:۱۲۵)۔ انھوں نے اپنے عزائم اور تمناؤں کا اظہار بھی واشگاف الفاظ میں فرمایا تھا کہ "ہماری ذریت بھی تیری فرماں بردار رہے"۔ اس گھر کو بناتے ہوئے جو دعا لبوں پر جاری تھی وہ صرف رب کے نزدیک قبولیت کی تمناؤں پر مشتمل تھی: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ (البقرہ ۲:۱۲۷)۔ اس کے علاوہ نہ کسی کی خوشنودی مطلوب تھی' نہ کسی کے صلہ و انعام پر نظر تھی۔
اس گھر کی آیات میں ایک روشن پیغام سعی کے اس عمل کے اندر بھی ہے جو صفا اور مروہ کے

درمیان کی جاتی ہے۔ یہ یادگار ہے اس بھاگ دوڑ کی جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پیاس سے جاں بلب دیکھ کر حضرت ہاجرہؑ نے صفا اور مروہ کے درمیان کی۔ کبھی صفا پر چڑھتیں' کبھی بھاگ کر جاتیں اور مروہ پر چڑھتیں۔ سعی کا پیغام یہ بھی ہے کہ اللہ کو ہم سے ارادہ کے ساتھ ساتھ سعی بھی مطلوب ہے' عمل اور کوشش بھی مطلوب ہے' اور اسی پر وہ نتائج مرتب فرماتا ہے۔ "ہر انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے وہ سعی کرے" (النجم ۵۳:۳۹)' اور "جو آخرت کا ارادہ کرے اور اس کے لیے سعی کرے جیسا کہ سعی کرنے کا حق ہے. . . اس کی کوشش کی پوری پوری قدردانی کی جائے گی" (بنی اسراء یل ۱۷:۱۹)۔ سعی کا پیغام یہ بھی ہے کہ جب بندہ اپنی بندگی کو اللہ کے لیے خالص کرے' اور حتی المقدور کوشش میں اپنے کو لگا دے' تو اس کا رب اک پتھریلی وادی میں شیرخوار بچے کی ایڑیوں تلے بھی کبھی ختم نہ ہونے والا چشمہ جاری کر دیتا ہے۔

امت مسلمہ کی کشتی آج جس قدر بھنور میں پھنسی ہوئی ہے' کیا وہ اس سے اپنے ہمہ اقتدار و اختیار رب پر ابراہیمؑ و ہاجرہؑ کی طرح کلی بھروسہ کیے بغیر' اس کی فرماں برداری کی راہ میں ان کی طرح اپنا سب کچھ حاضر کیے بغیر' اور اس راہ میں جان و مال سے سعی و جہد کیے بغیر' نکلنے کی کوئی راہ پا سکتی ہے؟ کیا جس کی نظر کے سامنے ہر روز پانچ مرتبہ بیت اللہ کی آیات بینات کو سامنے لانے کا اہتمام کیا گیا ہو' اس کی نفسیات میں ان سوالوں کی کوئی گنجایش ہو سکتی ہے کہ ایسی خراب قوم کیسے سدھرے گی' ایسے تاریک حالات کیسے بدلیں گے' ایسے بنجر اور سنگلاخ معاشروں میں نیکی کے چشمے کیسے پھوٹیں گے' ایسے گھٹاٹوپ اندھیروں میں روشنی کی کرن کیسے اور کہاں سے طلوع ہو گی' جبرواستبداد کی چٹانوں میں سے راستہ کیسے نکلے گا' حقیر کوششیں کیسے رنگ لائیں گی' زبردست طاقتوں کا مقابلہ کیسے ہو گا؟ اگر ایک عورت کے اس یقین کہ اِذَنْ لَا یُضَیِّعُنَا (پھر اللہ ہم کو ضائع نہ کرے گا)' اور اس اعلان کہ رَضِیْتُ بِاللّٰہِ (میں اللہ سے راضی ہوں)' اور اس کی صفا اور مروہ کے درمیان سعی و جہد کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ پتھروں کے ایک معمولی گھر کو یہ مقام عطا کر سکتا ہے' اور سنگلاخ زمین سے زم زم کا چشمہ رواں کر سکتا ہے' تو آج کی دنیا میں دین کو غلبہ کیوں حاصل نہیں ہو سکتا' اور ظلم و فساد سے بھری ہوئی دنیا میں نیکی کا چشمہ کیوں نہیں پھوٹ سکتا؟

دینے والا عاجز و درماندہ نہیں' نہ وہ اونگھ اور نیند کا شکار ہوتا ہے' لینے والے ہی عاجز و درماندہ ہو گئے ہیں' اپنے مقاصد سے اور اپنی قوت و سربلندی کے اصل خزانوں سے غافل ہو کر نیند میں مدہوش ہیں۔ سعی و عمل اور اخلاص و وفا کی جو دنیا ان سے مطلوب ہے اس کو انھوں نے اپنے ارادہ واختیار سے باہر سمجھ رکھا ہے۔ انسانیت ہدایت کے لیے جاں بلب ہے' فساد کے بیابان میں زیرزمین امن کا چشمہ موجود ہے' مگر یہ دور اپنے ابراہیمؑ کا منتظر ہے۔

حج کا دن تکمیل دین اور اتمام نعمت کی بشارت کا دن بھی ہے۔ اس سے اگلے دن ہی ساری دنیا کے مسلمان عیدالاضحیٰ کا جشن مناتے ہیں' اور اللہ کے حضور قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ کیا ان کے درمیان ربط کا ادراک بہت مشکل ہے۔ نزول قرآن کے آغاز کے دن' ضبط نفس اور تقویٰ' تلاوت قرآن اور قیام لیل کے ذریعے قرب الٰہی کے حصول کے لیے' وقف کیے گئے۔ تکمیل دین اور اتمام نعمت کے دن' قربانی اور حب الٰہی کے حصول کے لیے مختص کیے گئے۔

تکمیل و اتمام بغیر قربانی کے ممکن نہیں' اور قربانی بغیر محبت کے ممکن نہیں۔ اسی لیے حج کے مناسک تمام تر عشق و محبت پر مشتمل ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ لکھتے ہیں:

> حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا کہ سال میں ایک دفعہ اپنے کو سرگشتہ و شیدا بنا کر' دیوانوں کی طرح اور عشق بازوں کا وطیرہ اختیار کر کے' محبوب کے گھر کے گرد ننگے پاؤں' الجھے ہوئے بال' پریشان حال' گرد میں اٹے ہوئے' سرزمین حجاز میں پہنچیں' اور وہاں پہنچ کر کبھی پہاڑ پر' کبھی زمین پر' محبوب کے گھر کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں... اس خانۂ تجلیات کے ارد گرد چکر لگائیں' اور اس کے گوشوں کو چومیں چاٹیں۔

اسی محبت کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام میں یہ استعداد پیدا ہوئی کہ وہ ہر محبوب چیز کو اس کے لیے قربان کر دیں جو ایمان لاتے ہی سب سے بڑھ کر محبوب ہو جاتا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ ۲:۱۶۵) اور جب محبت کی آخری آزمایش آئی' بیٹے کو قربان کر دینے کے لیے کہا گیا' تو انھوں نے بیٹے کے گلے پر بھی چھری رکھ دی۔ جب وہ محبت کی ان ساری آزمایشوں میں پورے اترے (فَاَتَمَّهُنَّ) تو اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ نعمت بھی تمام کر دی جو دین کی نعمت کے اتمام کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

> وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ (البقرہ ۲: ۱۲۴)
>
> یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا' تو اس نے کہا: "میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں"۔

جو ایک مکمل دین کے حامل ہونے کا دعویٰ کرتے نہیں تھکتے' ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جب تک وہ محبت کے اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے تیار نہ ہوں گے کہ "کیا کوئی بھی چیز ایسی ہے جو اللہ' اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہے؟" اس وقت تک ان کے سروں پر سے امر الٰہی ٹل نہیں سکتا' اور وہ وعدۂ الٰہی کے مستحق ہو نہیں سکتے۔

صدق خلیل بھی ہے عشق' صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

(ترجمان القرآن' جون ۹۲)

سزائے قید: جدید قانون سازی کی ضرورت

پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی ٥

گاہے گاہے بچوں اور انسانی حقوق کی تنظیمیں پاکستان میں قیدی بچوں کو قانون سے ماورا سزائیں دینے اور ان کے حقوق نہ دینے پر سخت تشویش کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔ اسی طرح قومی پریس کے ذریعے خواتین کی سزائے قید اور جیلوں میں ان سے غیر اخلاقی اور غیر انسانی سلوک کے بارے میں احتجاج کیا جاتا رہا ہے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ پاکستان ایسے ملک میں جہاں آئین کے تحت اسلامی نظام کا نفاذ ہماری قومی اور دستوری ذمہ داری ہے' آج تک اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ سزائے قید کا بہ حیثیت مجموعی اور خواتین اور بچوں کو سزائے قید دینے کے معاملے کا بالخصوص' کتاب و سنت کی روشنی میں جائزہ لے کر از سر نو قانون سازی کی جائے۔

تعزیرات پاکستان کو شروع سے آخر تک کھنگالیے' جو سزا سب سے عام نظر آئے گی وہ سزائے قید ہے۔ جو اپنی طوالت یا شدت کے اعتبار سے کم و بیش ہونے کے باوجود بلاامتیاز مرد' عورت' بوڑھے' جوان اور بچوں سب کو دی جاتی ہے' سنگین جرائم میں بھی اور معمولی جرائم میں بھی۔ گویا جو تعزیراتی سزا سب سے عام ہے' وہ سزائے قید ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے تعزیرات کی مشروعیت میں حکمت یہ ہے کہ تعزیری سزا ارتکاب جرم سے باز رکھتی ہے۔ اگر کوئی شخص جرم کا ارتکاب کر چکے تو اس کی اصلاح و تادیب کرتی ہے' اور دوسرے لوگوں کو مجرم کے نقش قدم پر چلنے سے روکتی ہے۔ اس لیے ان امور کو پیش نظر رکھا جاتا ہے:

ا۔ ہر جرم کی سزا معاشرتی اور اجتماعی مصلحتوں کے تقاضے کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر اجتماعی مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ مجرم کو سنگین سزا دی جائے تو سزا سخت تر ہوتی ہے اور اگر مصلحت تخفیف کی متقاضی ہو تو سزا میں نرمی برتی جاتی ہے۔

---

٥ ڈین' فیکلٹی آف عربک اینڈ اسلامک اسٹڈیز' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی' اسلام آباد

۲۔ اگر معاشرتی مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ مجرم سے معاشرے کو پاک کر دیا جائے تو جرم کی نوعیت کے اعتبار سے اسے سزاے موت یا غیر محدود مدت کی قید کی سزا دی جاتی ہے۔

۳۔ جو سزائیں مجرم کی اصلاح اور معاشرے کو اس کی مجرمانہ کارروائیوں سے بچانے کے لیے دی جاتی ہیں ان میں کسی متعین سزا (مثلاً اتنے سال قید وغیرہ) پر اصرار کرنا درست نہیں بلکہ ہر فرد کی نفسیات اور ارتکاب جرم کے حالات کو دیکھتے ہوئے ایسی سزا دی جائے جس سے اس کی اصلاح ہو۔

۴۔ مجرم کی اصلاح اور اس سے انتقام لینے میں بنیادی فرق ہے۔ اصلاح کے لیے سزا کی وہی حیثیت ہے جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کو کسی لغزش پر سرزنش کرتا ہے یا ایک طبیب مریض کی جان بچانے کے لیے آپریشن کرتا ہے۔ ان دونوں بہ ظاہر بے رحمانہ کارروائیوں کے پس پردہ بے پناہ رحمت و شفقت کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ اسی طرح جرم کے لیے سزا کے تعین میں ایک ماہر سرجن کی طرح یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جرم کا مرض کس حد تک ہے اور مجرم کس حد تک سزا کا آپریشن برداشت کر سکتا ہے۔

۵۔ افراد معاشرہ کے درمیان جو معاشرتی تفاوت موجود ہوتا ہے' سزا کے تعین میں اسے بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ کسی بہت باعزت شخص کے لیے بعض حالات میں یہی سزا کافی ہوتی ہے کہ اسے احساس دلایا جائے کہ یہ کام اس کے منصب و مرتبے کے مطابق نہیں ہے' جب کہ کسی جرائم پیشہ فرد کے لیے ان الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا: اقیلوا ذوی الهیئات عثر اتہم الا الحدود (مسند احمد بن حنبل' ۶: ۱۸۱' نیل الاوطار' ۷: ۱۴۳-۱۴۴)--- باعزت لوگوں کی معمولی لغزشوں سے صرف نظر کر لیا کرو۔

جہاں تک سزاے قید کے جواز کا تعلق ہے تو قرآن حکیم کی دو آیات سے اس پر استدلال کیا گیا ہے۔ پہلی آیت کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ جو لوگ اسلامی ریاست میں فتنہ و فساد اور شرانگیزی کا ارتکاب کریں' ڈاکے ڈالیں' یا قتل و غارت کے مرتکب ہوں' ان کو ان کے جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے سزاے قید سے لے کر سزاے موت تک دی جا سکتی ہے۔

سورۃ المائدہ میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ط (المائدہ ۵: ۳۳) جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں' ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں' یا سولی چڑھائے جائیں' یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں' یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں۔

آیت کے مطابق مذکورہ چار سزاؤں میں سے کوئی بھی سزا دی جا سکتی ہے۔

دوسری آیت سورۃ النساء میں ہے:

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْھِدُوْا عَلَیْھِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ ج فَاِنْ شَھِدُوْا فَاَمْسِکُوْھُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا (النساء ۴: ۱۵) تمھاری عورتوں میں سے جو کوئی بے حیائی کا ارتکاب کرے تو اس پر چار گواہ لاؤ۔ اگر وہ گواہی دے دیں تو انھیں گھروں میں بند کر دو تاکہ وہ فوت ہو جائیں یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راہ نکالے۔

احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص پر کوئی الزام تھا۔ رسول اکرمؐ نے اسے کچھ وقت، غالباً ۲۴ گھنٹے کے لیے نظربند رکھا لیکن اس پر الزام ثابت نہیں ہوا تو اسے چھوڑ دیا گیا (ابوداود ۴: ۴۷)۔ ایک دوسرے موقع پر رسول اکرمؐ نے ایسے معاملے میں کہ ایک شخص کسی کو پکڑے رہے اور دوسرا اسے قتل کر دے، یہ فیصلہ فرمایا کہ قاتل کو قصاص میں قتل کر دیا جائے اور پکڑنے والے کو عمرقید کی سزا دی جائے (دارقطنی ۳: ۱۴۰، بیہقی ۸: ۵۰)۔

عہد نبویؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں باقاعدہ کوئی قیدخانہ نہیں بنایا گیا۔ اس لیے بعض حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ سزاے قید دینا سرے سے جائز ہی نہیں ہے، البتہ کسی شخص کو نظربند کیا جا سکتا ہے، اس پر کوئی نگران کھڑا کیا جا سکتا ہے یا اگر کوئی شخص قرض کی ادایگی میں بلاوجہ لیت و لعل سے کام لے رہا ہو تو قرض خواہ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرض دار کا پیچھا نہ چھوڑے (المغنی ۴: ۴۹۹، الطرق الحکمیۃ: ۶۲-۶۴، سبل السلام ۳: ۵۵)۔ لیکن عہد نبویؐ یا عہد صدیقؓ میں مستقل قیدخانہ نہ بنانے سے سزاے قید کا ناجائز ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت ضرورت نہیں سمجھی گئی ہو گی، جب کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں مکہ میں صفوان بن امیہ کا مکان چار ہزار درہم میں خریدا اور اس میں ہجوگو شاعر الحطیہ کو قید کیا، التمیمی کو جو قرآن حکیم کی بعض آیات کے بارے میں اوٹ پٹانگ باتیں کرتا تھا قید رکھا، اور ابومحجن الثقفی کو بار بار شراب نوشی کی وجہ سے قید کیا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے ایک پیشہ ور چور اور ٹھگ ضابی بن الحارث کو عمرقید کی سزا دی۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے بھی کچھ لوگوں کو قید کیا (الطرق الحکمیۃ: ۱۰۲، اقضیۃ الرسول: ۵، التعزیر فی الشریعۃ الاسلامیہ: ۲۹۶)۔

فقہاے اسلام نے قرآن و حدیث میں سزاے قید کے جواز کے تمام دلائل کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ قید کی صرف درج ذیل تین صورتیں جائز ہیں:

۱۔ کوئی شخص پیشہ ور مجرم ہے اور لوگوں کو اس کے شر سے بچانے کا بجز اس کے، کوئی طریقہ نہیں ہے کہ اسے قید کر دیا جائے۔ اسے تاحیات یا توبہ کر کے اپنی اصلاح کرنے تک سزاے قید دی جائے۔

۲۔ جس کے ذمے اللہ یا بندے کا کوئی حق ہے اور وہ شرعی جواز کے بغیر اس حق کی ادایگی میں کوتاہی کر رہا ہے۔ اسے اس وقت تک قید رکھا جا سکتا ہے جب تک وہ حق ادا نہ کرے۔

۳۔ جس شخص پر کوئی الزام ہے اسے قید کیا جا سکتا ہے تاآنکہ اس کی ضمانت نہ ہو جائے یا اس کے بارے میں تحقیق مکمل نہ ہو جائے۔

ان تینوں صورتوں کے پیش نظر یہ کہنا درست ہے کہ سزاے قید کی مدت مقرر کرنا' یا اسے عمومی سزا کے طور پر رواج دینا اسلامی قانون تعزیرات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اول الذکر مجرموں کو ساری عمر معاشرے سے الگ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے' اس لیے انھیں تاحیات سزاے قید دی جاتی ہے۔ البتہ ان کے لیے توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے اور توبہ سے مراد زبانی کلامی توبہ نہیں بلکہ اصلاح احوال ہے' یعنی وہ کسی بھی وقت اپنی زندگی کا نہج بدل کر معاشرے میں واپس آسکتے ہیں۔ دوسری صورت میں قید کا مقصد سزا دینا نہیں ہے بلکہ حقوق کی ادایگی ہے اور جونہی وہ شخص حق ادا کر دے اسے فوری طور پر رہائی مل جاتی ہے۔ جب کہ تیسری صورت میں اسلامی قانون عدل کا تقاضا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو' تحقیق کر کے اگر جرم ثابت ہو جائے تو سزا دی جائے ورنہ چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ رسولؐ اللہ نے صرف ۲۴ گھنٹے بعد' اور ایک دوسرے واقعے میں تقریباً ایک گھنٹے بعد ایسے ملزم کو رہا کرنے کا حکم دے دیا تھا (نیل الاوطار ۷: ۱۵۸-۱۵۹)۔

جہاں تک خواتین کی سزاے قید کا تعلق ہے تو قرآن حکیم کے صریح الفاظ یہ ہیں "انھیں گھروں میں بند کر دو" (النساء ۴: ۱۵)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کو جیل خانوں میں بھیجنا قرآن حکیم کی منشا کے مطابق نہیں ہے۔ قرآن کریم کی رو سے اگر انھیں قید کرنا پڑے تو انھیں گھروں میں' جہاں ان کے محرم رشتے داروں کی آزادانہ آمد و رفت ہو اور ان کی عزت و عصمت کے تحفظ کے مسائل نہ پیدا ہوں' وہاں قید کیا جائے۔ اور اگر خواتین کو جیل خانوں میں ہی بھیجنا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے جیل خانے انھیں اسی طرح تحفظ مہیا کرنے والے ہوں جیسا کہ ایک خاتون کو اپنے گھر میں حاصل ہوتا ہے۔ نیز قرآن حکیم کی آیت (البقرہ ۲: ۲۲۶) کی روشنی میں کسی بھی شادی شدہ جوڑے کو چار ماہ یا اس سے زائد ایک دوسرے سے الگ رکھنا جائز نہیں۔ اسی اصول کی بنا پر حضرت عمرؓ نے تمام شادی شدہ فوجیوں کو چار ماہ کے بعد لازمی چھٹی پر گھر بھیجنے کے احکامات جاری کیے تھے (شبلی نعمانی' الفاروق ' ص ۳۴۵)۔ چنانچہ کسی بھی شادی شدہ مرد یا خاتون کو سزاے قید دیتے ہوئے قرآن حکیم کے اس حکم کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

نابالغ بچوں کو سزاے قید دینے کے بارے میں فقہا کی آرا کا حاصل یہ ہے کہ اگر نابالغ لڑکا خود کاروبار یا تجارت کرتا ہو اور کسی کا ایسا مالی نقصان کردے جو قابل تعزیر ہو تو اس لڑکے کے بجائے' اس کے باپ یا

سرپرست کو اس وقت تک قید رکھا جائے جب تک کہ مالی نقصان پورا نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ بچے کا جرم درحقیقت والدین یا سرپرست کی تربیت کی خامی ہے جس کی اسے سزا ملنا چاہیے۔ بعض علما نے اس صورت میں بچے کو اس وقت تک قید رکھنے کی اجازت دی ہے جب تک والدین یا سرپرست نقصان کی تلافی نہ کر دے (المبسوط ۲۰:۹۱)۔

فوج داری جرائم میں بچے کو سزا کے طور پر قید نہیں رکھا جا سکتا' البتہ تادیب اور اصلاح کے لیے اسے قید کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ سزاے قید موجب اصلاح ہو۔ اکثر فقہا کی رائے یہ ہے کہ عورتوں کی طرح بچوں کو بھی ولی یا سرپرست کے گھر قید کیا جائے۔ انھیں عام قید خانوں میں نہ رکھا جائے (حاشیہ ابن عابدین ۴: ۲۵۷' ۵: ۴۲۶' المغنی ۸: ۱۱۵)۔

اگر سزاے قید کو اس پہلو سے دیکھا جائے کہ تعزیراتی سزا میں جو حکمت و مصلحت کارفرما ہوتی ہے' کیا سزاے قید سے وہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں؟ تو درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ قید کی سزا بجائے خود ملکی ترقی کے لیے سدراہ ہے۔ اگر اس بات کا حساب کیا جائے کہ ملک بھر میں قیدیوں کی کل تعداد کتنی ہے اور اس میں سے کتنے ایسے ہیں جو اپنی صلاحیتیں پیداآوری کاموں میں صرف کر کے ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے سکتے ہیں لیکن باوجود کوشش کے ان کے لیے جیل خانوں میں مناسب کام مہیا نہیں کیے جا سکے تو چشم کشا صورت حال سامنے آئے گی۔ ان کی صلاحیتیں اور قوت کار ضائع ہوتی ہے۔ اس سے ایک طرف قومی آمدنی میں کمی واقع ہوتی ہے اور دوسری طرف ان کے اخراجات اور ان کی وجہ سے جیل خانوں پر اٹھنے والے بھاری اخراجات قومی خزانے پر بوجھ بنتے ہیں' جب کہ سزاے قید کے علاوہ بھی تعزیرات کے ایسے طریقے ہیں جن کو بروئے کار لا کر لوگوں کو جرائم سے باز اور محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اور اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو کام سے معطل کر کے ان کے اخراجات قومی خزانے پر ڈالنے کے عمل کو بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اگر سزاے قید سے کوئی اصلاح کی صورت پیدا ہوتی تو اتنے بھاری اخراجات برداشت کرنے کا جواز بھی تھا۔ لیکن مشاہدات و تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدخانے اصلاحی مراکز بننے کے بجائے جرائم کی تربیت کے مراکز ہیں۔ جیلوں میں بسااوقات ایسے لوگ بھی چلے جاتے ہیں جو طبعاً اور حقیقتاً جرائم پیشہ نہیں ہوتے بلکہ کسی اتفاقی حادثے میں ان سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا ہے اور وہ جرائم سے نفرت کرتے ہیں لیکن جب ایک بار جیل یاترا کر آتے ہیں تو وہاں انھیں ایسے ایسے ماہرین فن کی صحبت میسر آتی ہے کہ ان پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ عیب اور بدنامی کا جو داغ' دامن پر ایک بار اتفاقاً لگ چکا ہوتا ہے وہ اسے فن کی بلندیوں تک پہنچانے کا عزم لے کر جیل سے باہر آتے ہیں۔

۳- سزاے قید میں غالباً سرے سے یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ جرائم سے باز رکھنے میں ایک موثر عامل ثابت ہو، کیوں کہ اعداد و شمار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو لوگ جتنی سخت سزاے قید بھگت کر آتے ہیں، باہر آکر اسی قدر بڑا جرم کر کے واپس قید خانے پہنچ جاتے ہیں۔ اگر سزاے قید جرائم سے باز رکھنے میں موثر ہوتی تو سزا بھگت کر آنے والے افراد دوبارہ ان جرائم کا ارتکاب نہ کرتے۔

۴- سزاے قید کا ایک اور اثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اس کی وجہ سے احساس ذمہ داری ختم ہو جاتا ہے۔ جو شخص ایک طویل مدت تک اپنے افراد خانہ کی ضروریات کی کفالت کی ذمہ داریوں سے دور، سرکاری نان نفقے پر پرورش پاتا ہے، اس کے دل سے رفتہ رفتہ یہ احساس ہی جاتا رہتا ہے کہ آدمی کو اپنی اور اپنے کنبے کی ضروریات کی کفالت کے لیے خود جدوجہد کرنی چاہیے۔ مزید برآں معاشرے میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو اپنی سزاے قید کو باعث فخر سمجھتا ہے اور اسے پُرامن شہریوں سے کیش کرواتا ہے۔ چنانچہ تمام شہروں میں نام نہاد پہلوانوں کے گروہ جو شہریوں سے بھتہ وصول کرتے ہیں اور ان پر اپنا رعب و دبدبہ رکھتے ہیں، ہمارے جیل خانوں کی پیداوار ہیں۔ اور جب ان ہی پہلوان نما افراد کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو پورے معاشرے کی زمام کار جرائم پیشہ طبقے کے ہاتھ میں آجاتی ہے جو کسی بھی ملک، قوم اور معاشرے کے لیے تباہی کا آخری درجہ ہے۔

۵- جیل خانوں میں غیر صحت مند ماحول، طبی سہولتوں کی کمی، جگہ کی قلت اور افراد کی کثرت کے باعث گوناگوں طبی اور اخلاقی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ قیدی بے شمار جلدی، صدری اور جنسی امراض لے کر معاشرے میں پھیل جاتے ہیں۔

انھی اسباب کی بنا پر اسلامی نظام تعزیرات میں سزاے قید کو کبھی عمومی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ سزاے قید کی حیثیت روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی برائیوں کے سدباب کے لیے معمولی سزا کی تھی کہ چند روز کسی شخص کو قید میں رکھ کر تنبیہہ کر دی جائے۔ اور ایسے لوگ چونکہ دوبارہ جیلوں میں نہیں آتے اور ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہوتی اور جیلوں میں ان کا قیام بہت مختصر ہوتا ہے، اس لیے اس سے وہ خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں جو طویل سزاے قید کا ورثہ ہیں۔ اس طریق کار کی وضاحت امام ابویوسفؒ کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ہارون الرشید کی درخواست پر اس کی حکومت کے لیے نظام کار کے طور پر تیار کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> اگر آپ حدود کے نفاذ کے لیے احکام جاری کر دیں تو قیدیوں کی تعداد کم ہو جائے گی اور جرائم پیشہ لوگ اپنی شرارتوں سے باز آ جائیں گے۔ قیدیوں کے معاملات پر توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ اس لیے آپ اپنے حکام کو ہدایت کریں کہ ہر چند روز کے بعد قیدیوں کے معاملات کا جائزہ لیں۔ جسے سزا

دینی ہو' سزا دے کر آزاد کر دیں اور جس پر جرم ثابت نہیں ہوا' اسے فوراً چھوڑ دیں اور سزا دینے میں حد سے تجاوز نہ کریں (کتاب الخراج)۔

تمام اسلامی فقہا تعزیر کے طور پر بدنی سزا (کوڑے مارنا) دے کر مجرم کو فوری طور پر رہا کرنے کے قائل رہے ہیں تاکہ وہ اپنے جرم کی سزا بھگت کر اپنی روز مرہ زندگی میں واپس چلا جائے اور آیندہ کے لیے محتاط زندگی گزارے۔ یاد رہے کہ اسلامی نظام تعزیرات کے کوڑوں اور مارشل لائی کوڑوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تعزیری کوڑے کا مقصد سزا دینا ہے۔ جان سے مارنا' زخمی کرنا یا ناکارہ کر دینا نہیں ہے۔

ان تمام امور کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قیدیوں کی دیکھ بھال اور ان پر اٹھنے والے اخراجات جو ہر سال کروڑوں تک پہنچ جاتے ہیں' سرکاری خزانے سے پورے کیے جاتے ہیں۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ملک کے شہری ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ گویا قیدیوں کے اخراجات کی ذمہ داری اس معاشرے پر ڈال دی گئی ہے جس کے خلاف جرم کر کے وہ سزاے قید بھگت رہے ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ایک طرف معاشرہ جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں زخم خوردہ ہے اور دوسری طرف اپنے خلاف جرم کرنے والوں کی کفالت کی ذمہ داری کے زیربار ہے۔ اس صورت حال میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ سزاے قید کی صورت میں اصل سزا معاشرے کے بے گناہ افراد کو دی جاتی ہے جو دوگنا ہے' زیادتی کا شکار بننے کی اور ٹیکس دے کر مجرموں کو پالنے کی بھی۔ کیا قانون ساز اداروں کا فرض نہیں ہے کہ وہ ان حقائق پر غور کریں؟

ہماری تجویز یہ ہے کہ تعزیرات پاکستان اور اس نوعیت کے دوسرے قوانین کا جائزہ لے کر تعزیری نظام کی اصلاح کے لیے اقدام کیا جائے یا وفاقی شرعی عدالت جس کے پاس کتاب و سنت کی روشنی میں قوانین کا ازخود جائزہ لینے کا اختیار موجود ہے' اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے موجودہ قوانین کو جانچنے کے اقدامات کرے۔ سب سے بہتر طریق کار یہ ہو گا کہ تعزیرات پاکستان میں پیوند کاری کے بجائے پورے تعزیراتی قانون کو کتاب و سنت کے مطابق مدون کر کے اسے قانون ساز اداروں سے منظور کرایا جائے۔

نئی مطبوعات

۱۔ اسلامی جامعات	ظہیر الدین بھٹی (مترجم)
۲۔ حرمین الشریفین اور تبرکات نبویؐ	علی اصغر چوہدری
۳۔ سائنس خدا کے حضور میں	پروفیسر راؤ مختار احمد
۴۔ ذوالجلال والاکرام	شاہدہ ناز قاضی
۵۔ شعلہء گفتار	محمد منیر افضل
۶۔ تفہیم القرآن کی تمثیلات و تشبیہات	ڈاکٹر محمد جنید
۷۔ تسہیل القرآن	میر محمد حسین
۸۔ قرآنی سورتوں کے موضوعات و مرکزی مضامین	امیر محمد حسین
۹۔ سیرت نبویؐ میں عورت کا کردار	پروفیسر عاصمہ فرحت
۱۰۔ امریکہ میں مسلمان اور ان کی قیادت	ابراہیم ہمدانی
۱۱۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات	عرفان حسن صدیقی
۱۲۔ احکام الٰہی	مرزا جاوید اقبال
۱۳۔ دعوت ایمان	محمد ندیم اعظم
۱۴۔ تفہیم الاسلام (نہم و دہم)	
۱۵۔ جدید ترکی میں اسلامی بیداری	ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
۱۶۔ عالم عرب پر مشنری یلغار	ظہیر الدین بھٹی (مترجم)
۱۷۔ اسلام جدید دور میں	سلمان حسین خان

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

فون : 7664504-7669546 فیکس : 7658674

e-mail: islamic@ms.net.pk

شوروم : ۱۰۔شیفر جی روڈ، اردو بازار لاہور۔ فون : 7248676

ترقی اور "انتشار عظیم"

پروفیسر عبدالقدیر سلیم ○

انیسویں اور بیسویں صدی کو "سائنس" کی صدی کہا گیا۔ اب' جب کہ بیسویں صدی بھی اختتام پذیر ہو گئی' اور اس کے ساتھ ہی ساری دنیا اکیسویں صدی--- اور اس کے ساتھ ہی الف ثالث میں داخل ہو چکی ہے (یا کم از کم اس کا عمومی طور پر دعویٰ کیا جا رہا ہے)' ہم ایک نئے عہد میں داخل ہو رہے ہیں۔ سائنس کی "برکات" ریل' موٹر کار' بجلی اور اس سے چلنے والے آلات ریڈیو' ٹیلی فون' ٹی وی' بھاپ' بجلی اور گیس سے چلنے والی مشینیں اور کارخانے' ساری دنیا میں عام ہو گئے ہیں' اور اب ان میں کوئی عجوبہ اور حیرت نہیں رہی کہ یہ روز مرہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ مگر بیسویں صدی کے آخری چند سالوں میں اس روز افزوں ترقی میں ایک نیا عنصر بھی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے' جو بیسویں صدی کے نصف آخر کے شروع شروع میں شرماتا اور لجاتا ہوا ترقی یافتہ دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہوا' اور اب نہ صرف وہاں اپنی گرفت مضبوط کر چکا ہے' بلکہ ساری دنیا کو اپنے مضبوط شکنجے میں جکڑ لینے کے لیے تیار ہے۔ امریکہ' یورپ اور معاشی طور پر آسودہ ممالک ایک نئے عہد میں داخل ہو رہے ہیں' جسے "عہد اطلاع" (information age) اور "مابعد صنعت دور" (post-industrial era) کا نام دیا گیا ہے۔ مستقبل دان الون ٹوفلر نے اس پیش رفت کو "تیسری لہر" (third wave) کا نام دیا ہے (آلون ٹوفلر: The Third Wave' ۱۹۸۰)۔ بقول اس کے پہلی لہر نے انسان کو شکار اور غذا کی تلاش میں سرگرداں حیوان کے دائرے سے نکال کر کاشت کار کے درجے تک پہنچایا' جس میں اس نے زمینوں کو آباد کرنا اور بستیوں کو بسانا شروع کیا' اور خانہ بدوشی کی زندگی ختم کی۔ پھر دوسری پیش رفت زرعی معاشرے سے صنعتی معاشرے کی طرف ہوئی' جب کارخانے اور بڑے بڑے شہر وجود میں آئے اور مشینی دور نے رسل و رسائل میں انقلاب پیدا کر کے "صنعتی انقلاب" کی طرح ڈالی۔ اور اب ہم اس تیسری لہر کے شانے پر ہیں' جو ایک بالکل نئے معاشرے' نئی معاشرت اور نئے

○ وزٹنگ پروفیسر' انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن' کراچی

طرز فکر کو جنم دے رہی ہے۔

اس نئے معاشرے کے اشاریے "ترقی یافتہ" ملکوں میں واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ملک جو اپنی صنعتی ترقی کی انتہا کو چھو چکے ہیں (یا چھو رہے ہیں) ان میں معیشت' قومی پیداوار اور دولت کا دارومدار اشیا سازی کے بجائے اب "خدمات" کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔ صنعتی معاشرے کے بجائے "اطلاعی معاشرہ" جنم لے رہا ہے' جس کا ایک عام محنت کش کسی فولاد سازی یا کارسازی کی صنعت کے بجائے کسی بینک' ریستوران' دفتر' جامعہ' تحقیق و ترقی کے ادارے' سوفٹ ویئر کی فرم' یا ابلاغ' اشغال اور تفریح کی کسی جہت میں مصروف کار نظر آتا ہے۔ جسمانی مشقت ("چکی کی مشقت") کی جگہ ذہنی مشقت (مشق ذہن و ذہانت) لیتی جا رہی ہے۔ وہ کام' جو پہلے مزدور اپنے ہاتھ پیروں سے کرتے تھے' اب مشینیں کرتی ہیں' اور فارغ مزدور ایک دوسری طرح کی مزدوری کرنے پر لگائے جا رہے ہیں--- "ذہنی مزدوری"۔ پھر ریڈیو' ٹی وی' ٹیلی فون' فیکس' ای۔میل' کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے عام ہو جانے سے اطلاعات کی جلد اور بہ سہولت ترسیل' آسان سے آسان تر ہوتی جا رہی ہے' اور اس کے ساتھ ہی قومی حدود اور مقامی ثقافتوں کی حد بندیاں شکست و ریخت کے عمل سے دوچار ہوتی جا رہی ہیں۔ سائنس اور فنیات کی یہ پیش رفت ایک نئے معاشرے میں دھکیلے دے رہی ہے' اور وہ ہے "اطلاعی معاشرہ"۔ گویا ایک بالکل نئی دنیا ظہور پذیر ہو رہی ہے' جس کے خدوخال سے ہمارے آبا و اجداد واقف نہ تھے' اور اس کا شعور ہمیں بھی رفتہ رفتہ ہی ہو رہا ہے۔

فرانسس فوکویاما' جو ایک جاپانی نژاد امریکی عالم عمرانیات ہے' دنیا کے اس بدلتے ہوئے موسم پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اس کی کئی تحریریں' جن میں "تاریخ کا خاتمہ اور آخری انسان (The End of History and the Last Man) ۱۹۹۲' اور "اعتماد: معاشرتی فضائل اور تخلیق خوش حالی" (Trust: Social Virtues and the Creation of Prosperity) ۱۹۹۵ سے اہل علم کی توجہ کا مرکز بن چکی ہیں' اور ان پر کافی گفتگو ہوئی ہے۔

حال ہی میں اس کی تازہ تصنیف "انتشار عظیم" (The Great Disruption' شائع کردہ: پروفائل بکس' لندن ۱۹۹۹) نے ایک مرتبہ پھر سماجیات' سیاسیات' معاشیات اور بین الاقوامی تعلقات کے علما کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ جس اطلاعی معاشرے کی ہم بات کر رہے تھے' فوکویاما' خود بھی اس کے منصۂ وجود میں آنے سے کچھ پریشان محسوس ہوتا ہے' مگر وہ خود اعتماد بھی ہے۔ آیئے اس کے خیالات کو کچھ تھوڑی سی تفصیل سے دیکھیں۔

فوکویاما کے نزدیک "اطلاعی معاشرہ" دو ایسے رجحانات کا سبب بنتا ہے' جنھیں آج کے نام نہاد جمہوری دور میں لوگ بہت اہمیت دیتے ہیں: آزادی اور مساوات۔ آج لوگوں کو آزادی ہے کہ ٹی وی یا کیبل کے

درجنوں چینلز میں سے جسے چاہے دیکھیں' انٹرنیٹ پر جس سے چاہیں پینگیں بڑھائیں' تفریح کے درجنوں ذرائع میں سے جس سے چاہیں لطف اندوز ہوں۔ ڈھیلے ڈھالے اخلاقی رویوں کے صدقے' من مانی کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے۔ نوجوانوں کو تو چھوڑیئے' بچوں کے رویوں اور طرز زندگی پر بھی والدین کی قدغن بعض صورتوں میں غیر قانونی بن چکی ہے۔ کھانے' پہننے (یا نہ پہننے) کی پابندیاں بڑی حد تک ختم ہو چکی ہیں۔ اس کے خیال میں عوام پر سے حکمرانوں کا اختیار کم ہو گیا ہے۔ بیوروکریسی کے سخت ضابطے ڈھیلے پڑتے جا رہے ہیں' اور فرد کے اختیار اور آزادی میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قیدوبند' ممنوع و مباح' جائز و ناجائز کی بحثیں بے معنی ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کا ادراک کچھ یوں ہے کہ جس طرح پرانی آئی بی ایم اور اے ٹی اینڈ ٹی جیسی بڑی دیوپیکر کارپوریشنوں کی جگہ چھوٹی کارپوریشنوں کو فروغ ہو رہا ہے' اسی طرح سوویت یونین اور مشرقی جرمنی جیسی سخت گیر اور مقتدر مطلق ریاستوں کے انہدام سے اب زیادہ جمہوری اور آزاد ریاستیں وجود میں آ رہی ہیں' کیوں کہ سابقہ ریاستیں جو قصۂ پارینہ بن چکی ہیں اپنے شہریوں کے علم' شعور اور "آگاہی" کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

اس عہد اطلاع یا عہد آگاہی (information age) کا ظہور امریکہ میں نوے کے عشرے میں انٹرنیٹ کی شروعات کے ساتھ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن فوکویاما کے مطابق امریکہ میں عہد صنعت کے بجائے "عہد خدمت" (service) کا آغاز اس سے بہت پہلے ساٹھ کے عشرے ہی میں ہو چکا تھا۔ اسی عہد سے جرائم کی شرح اور سماجی انتشار کی کمیت اور کیفیت میں بھی قابل ذکر اضافہ شروع ہوا۔ دنیا کے متمول ترین خطوں (شمالی امریکہ' مغربی یورپ' جاپان) کے گنجان شہروں کے اندرونی علاقے عملاً ناقابل رہایش بنتے گئے۔ دو سو سال سے (صنعتی انقلاب کے آغاز سے) قرابت داری (جسے اسلامی اصطلاح میں ہم صلہ رحمی کہہ سکتے ہیں) اور سماجی نظم کا جو زوال شروع ہوا تھا' بیسویں صدی کے نصف آخر میں اس کی ابتری اور تنزل کی رفتار حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی۔ بیشتر یورپی ممالک اور جاپان میں شرح پیدایش اس تیزی سے نیچے آئی ہے کہ اگر وہاں خاصی تعداد میں "مہاجرین" جا کر آباد نہ ہو گئے تو اگلی صدی میں یہ ملک تقریباً خالی ہو جائیں گے۔ خاصی تعداد میں لوگ شادیوں کے بغیر ہی گزارا کرنے لگے ہیں' بچوں کی پیدایش کی شرح کم اور طلاقوں کی شرح بڑھنے لگی ہے۔ امریکہ اور اسکنڈی نیویا کے ملکوں میں اب ہر تیسرا بچہ شادی کے بندھن سے آزاد ہی پیدا ہوتا ہے۔ قتل و غارت گری اور سماجی انتشار پر مستزاد اس گذشتہ نصف صدی میں یہ ہوا کہ عوام کا اداروں پر سے اعتماد اٹھتا چلا گیا۔ نصف صدی پیشتر امریکہ اور یورپ کے اکثر شہری اپنی حکومت' سرکاری اداروں اور نجی اداروں اور عام شہریوں پر بالعموم اعتماد کا اظہار کرتے تھے لیکن ۹۰ کے عشرے میں کم ہی لوگوں کو ایک دوسرے پر اور حکومتی اداروں پر اعتماد اور بھروسا رہ گیا۔ مستقل روابط اور دیرپا تعلقات میں قابل ذکر کمی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ بیشتر "ترقی یافتہ" صنعتی دنیا میں سماجی

اقدار اور عمومی صورت حال میں واضح زوال کے آثار صاف نظر آرہے ہیں۔

فوکویاما کہتا ہے کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہونے والی یہ تبدیلیاں تدریجی نہیں' بلکہ ڈرامائی انداز کی تھیں (اور ان کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے)' اور اگرچہ گذشتہ دو ڈھائی صدیوں سے صنعتی انقلاب کے بعد ہی سے سماجی اقدار میں شکست و ریخت کا عمل محسوس طور پر نظر آنے لگا تھا' تاہم بیسویں صدی کے نصف آخر میں صنعتی ملکوں میں صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ٹوٹ پھوٹ کا یہ عمل اس تیزی کے ساتھ واقع ہوا کہ اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ اقدار کی اس شکست و ریخت اور معاشرے کے اس انتشار کو وہ "انتشار عظیم" (The Great Disruption) کا نام دیتا ہے۔

یہ ڈھے جانے کا عمل اور انتشار ایک بھیانک اور تلخ حقیقت ہے۔ یہ سنہرے ماضی کی خواب ناک وادیوں میں گم ہو جانے کی خواہش نہیں' بلکہ ایک درشت اور کرب ناک حقیقت ہے' جسے شماریاتی طریق پر' بڑھتے ہوئے جرائم' بے پدر اولاد' کاروبار اور سیاست میں اخلاق اور اعتماد کے فقدان' تعلیمی مواقع کے زوال اور بے کار نوجوانوں کی بے مصرف فوج کے بڑھتے ہوئے اعداد کی روشنی میں ناپا جا سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مغربی معاشروں میں یہ منفی سماجی رجحانات کیوں ظہور پذیر ہوئے' جب کہ شمالی امریکہ اور یورپ کے ممالک کی معیشتیں' عہد صنعت سے عہد اطلاع کی طرف حرکت کر رہی تھیں۔ کیا آنے والے عہد اطلاع اور ان منفی سماجی اقدار میں کوئی علت و معلول کا رشتہ دریافت کیا جا سکتا ہے؟ یا محض یہ ایک اتفاق ہے کہ مغربی معاشروں میں ڈھیلے پڑتے ہوئے معاشرتی بندھن اور اخلاقی اقدار کے زوال میں نمایاں رجحان ایک ایسے زمانے میں دیکھنے میں آرہے ہیں جب وہاں کی معیشتیں' صنعتی دور کے بعد "عہد اطلاع" میں داخل ہو رہی ہیں؟

فوکویاما اپنی اس تازہ تصنیف میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ واقعتاً ان دو مظاہر کے درمیان علت و معلول کے رشتے موجود ہیں۔ یہ رشتے اپنی نوعیت کے اعتبار سے فنیاتی' معاشی اور ثقافتی ہیں۔ کام اور معاشی مصروفیات کی ماہیت میں کچھ اس طرح کی تبدیلی آئی ہے کہ جسمانی محنت اور مشقت کی جگہ اب ذہنی محنت لیتی جا رہی ہے' اور اس کے نتیجے میں کروڑوں خواتین اپنے گھروں سے نکل کر معاش کے میدانوں میں پہنچ رہی ہیں۔ نتیجتاً گھر اور خاندانی نظام' جو روایتی اقدار کے گہوارے ہوا کرتے ہیں' تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف طبی فنیات' بشمول مانع حمل ادویات اور دوسرے طریقوں نے' نیز معالجاتی وظائف نے شرح اموات کو کم کیا ہے' پیدائش کی شرح گھٹائی ہے' اور عمر کے طول میں اضافہ کیا ہے۔ اس سے بھی لوگوں کی زندگی میں بچے پیدا کرنے اور خاندان کی تشکیل کے عمل کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ بچے' خاندان اور بڑا گھرانہ' جو پہلے بڑھاپے کا سہارا تصور ہوتے تھے' اب بے معنی بنتے جا رہے ہیں' کہ ان کی ضرورت

ہی نہیں رہ گئی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انفرادیت پسندی کے کلچر کو جو زبردست فروغ ہوا ہے، اس نے اتھارٹی کے سارے بندھنوں کو کمزور کر دیا ہے، اور ان علائق کو بے جان کر دیا ہے، جو خاندان، محلے، گاؤں اور شہراور پھرپوری پوری قوم کے شیرازے کو تھام کر رکھتے تھے۔ یہ انفرادیت، منڈی، بازار اور معمل میں تو مطلوب تھی، جہاں نت نئے تجربوں سے نئی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں، اختراع، ایجاد اور نشوونما کا کلچر پروان چڑھتا ہے، اور نئے راستوں کی طرف پیش رفت ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ دھوپ سماجی اقدار کے معیارات مطلوب کی وادیوں میں داخل ہوئی، تو اس نے بڑی تباہی پھیلائی۔ اس طرح بقول عالم معاشیات جوزف شوم پیٹر (Schumpeter) فنیاتی ترقی سے منڈی میں جس "تخلیقی تخریب" (creative destruction) کا آغاز ہوا تھا، سماجی روابط اور اقدار کے میدان میں بھی اسی انداز کی تخریب و تباہی نمودار ہونے لگی (یہ اصطلاح اولاً شوم پیٹر نے Capitalism, Socialism and Democracy میں ۱۹۵۰ میں استعمال کی تھی)۔

مگر حال کا تجزیہ کرنے سے پہلے آیئے فوکویاما کے قدم بقدم ہم ماضی کے ان عوامل کا جائزہ لیتے ہیں، جو موجودہ صورت حال کے منطقی طور پر ذمہ دار ہیں۔

موجودہ فنیات (ٹکنالوجی) جو یورپ اور پھر پوری دنیا میں صنعتی انقلاب کی داغ بیل ڈالنے کی ذمہ دار ہے، اپنی جلو میں ایک معاشرتی اتھل پتھل کو بھی ساتھ لائی۔ اشیا اور دولت کی پیدایش کے نئے نئے طریقوں اور ایجادات و اختراعات کے نتیجے میں انسانی معاشرے میں جدیدیت کا ایک ایسا عمل شروع ہوا، جس کی رفتار تیز ہی ہوتی چلی جا رہی ہے، اور اس کے رکنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ دخانی انجنوں سے چلنے والی کلوں نے نئی صنعتوں کو جنم دیا، اور پارچہ بافی جیسی روایتی صنعتوں میں اور رسل و رسائل کے میدان میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ریل گاڑیاں، خشکی پر اور جہاز، سمندروں میں بڑی تعداد میں انسانوں اور اموال کو سہولت کے ساتھ طویل فاصلوں تک لے جانے لگے۔ برطانیہ، یورپ اور پھرامریکہ میں یہ انقلاب اتنی تیز رفتاری کے ساتھ پھیلا کہ اس سے نہ صرف ان علاقوں کی صورت بدل گئی، بلکہ جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچے، وہاں بھی تبدیلی کا عمل واضح طور پر محسوس ہونے لگا۔ مغربی دنیا میں زرعی معاشرے، سو سال سے بھی کم عرصے میں شہری صنعتی معاشروں میں تبدیل ہونے لگے، اور اس کے ساتھ ہی دیہی زرعی معاشرے کے طور طریقوں، عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو کارخانوں اور شہری زندگی کے آہنگ کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی۔

ایک زرعی معاشرہ (چاہے وہ یورپ ہی کا ہو)، چھوٹے دیہاتوں اور مختصر آبادیوں کے مجموعوں پر مشتمل

ہوتا ہے۔ ان آبادیوں میں افراد کا ایک دوسرے سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ معاشرے کے بندھن مضبوط ہوتے ہیں۔ اکثر لوگوں میں باہم رشتہ داریاں یا قبائلی تعلق ہوتا ہے' اور وہ ایک دوسرے سے ذاتی شناسائی رکھتے ہیں۔ افراد' ایک دوسرے کے ساتھ اپنے پیشہ ورانہ علائق' سماجی تعلقات اور تفریحات تک میں یوں باہم گتھے ہوئے ہوتے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے پر لازماً انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہ سارے رشتے' روایتی ہوتے ہیں' اور روایت ہی ان بستیوں کے رہنے والوں کو آپس میں جوڑ کر رکھتی ہے۔

صنعتی انقلاب کے نتیجے میں ان چھوٹی آبادیوں اور دیہاتوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی شروع ہوئی' اور نتیجے کے طور پر بڑے بڑے شہر وجود میں آئے' یعنی بڑی شہری صنعتی آبادیاں۔ سماجی تعلقات میں فرد اور فرد کا رشتہ ڈھیلا پڑتا چلا گیا' تعلقات رسمی ہوتے گئے' اور فرد' فرد کی بجائے "نظام" سے وابستہ ہو گیا۔

اب اس نئے نظام کی ایک خوبی یہ تو ضرور تھی کہ اس میں اخلاقی اقدار اور غیر رسمی رسم و رواج کی جگہ باقاعدہ قوانین اور ضابطوں نے لے لی۔ دیہی دہقانی معاشروں میں اکثر بڑے زمین دار اور سردار اپنی مرضی کو قانون بنا لیتے تھے۔ باپ اور بیٹے کا تعلق' افراد خاندان کا ایک دوسرے سے رشتہ یا آقا اور غلام (خادم) کا تعلق' ابدی اور دائمی ہوتا تھا۔ اگرچہ ان تعلقات کی نوعیت کوئی تحریری یا رسمی انداز میں بہت زیا متعین نہیں ہوتی تھی' تاہم یہ باقی رہنے والے رشتے تھے۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں وجود میں آنے والے معاشرے میں رشتے "معاہدے" پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایک مزدور اتنے گھنٹے کام کرے گا' یا اتنی مقدار میں اشیا پیدا کرے گا' اور اس کے بدلے میں اسے اتنی اجرت اور یہ سہولتیں حاصل ہوں گی۔ قبل صنعتی (دیہی) معاشرے میں افراد کے درمیان علائق کی بنیاد' اخلاقی اقدار تھیں۔ صنعتی (شہری) معاشرے میں یہ علائق "قانون" اور "ضوابط" کی بنیاد پر قائم کیے گئے' جس میں حقوق و فرائض کو باقاعدہ طور پر واضح انداز میں تحریری شکل دے دی گئی اور اس طرح ذاتی تعلق کے بجائے "قانونی تعلق" نے لے لی۔ افراد کے درمیان اخلاقی رشتہ ختم ہوا تو ہر فرد آزاد تھا کہ قانونی معاہدے کے تحت جب تک چاہے دوسرے فرد سے تعلق رکھے' اور جب چاہے اسے خیرباد کہہ دے۔

زرعی دیہی معاشرے سے صنعتی شہری معاشرے کی طرف مغربی ملکوں کی یہ "پیش قدمی" بیسویں صدی کے وسط تک تقریباً مکمل ہو گئی تھی۔ مگر اس کے بعد امریکی معاشرے کی سیادت میں مغربی معاشرے ایک نئی جہت کی طرف بڑھنے لگے جسے ڈینیل بیل (Daniel Bell) نے مابعد صنعتی معاشرے (post industrial society) کا نام دیا ہے' اور اب کمپیوٹر اور برقیاتی اطلاعی فنیات کے عام رواج پا جانے سے جسے "اطلاعی معاشرہ" (information society) کہا جانے لگا ہے۔

صنعتی انقلاب سے اس "اطلاعی انقلاب" کی طرف انسانی معاشروں کی یہ زقند کیا اتنی ہی بڑی ہے'

جتنی زرعی معاشرے کی صنعتی انقلاب کی طرف تھی؟ اگر صورت حال یہی ہے' تو انسانی معاشرے کو اپنے نظام اقدار و اخلاق میں زبردست تبدیلیوں اور بڑے اتھل پتھل کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

فوکویاما نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آج کی (مہذب!) جمہوری ریاستیں (جن کا سرخیل امریکہ ہے)' موجودہ فنیاتی اور معاشی تبدیلیوں کے جلو میں اپنا روایتی بندوبست باقی رکھ سکیں گی یا نہیں؟ یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ مغربی دنیا نے غیر رسمی' غیر تحریری رسم و رواج اور اخلاقی اقدار کے بجائے ایک رسمی' تحریری قانون اور "ضابطے" کو رواج دے کر معاشرے کی بقا اور اسے بدنظمی اور انتشار سے بچانے کی سمت جو قدم اٹھایا ہے' جو "ادارے" قائم کر دیے ہیں' وہی اس کی تادیر سلامتی کے ضامن ہیں۔ ہر فرد اور گروہ کو معلوم ہے کہ قانون اس سے کیا تقاضا کرتا ہے' اور اسے کیا کرنا چاہیے' اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ قانون کی حکمرانی کو جنم دینا مغربی تہذیب کے سب سے زیادہ قابل فخر کارناموں میں سے ایک ہے" (ص ۱۱)۔ یہ بات صحیح ہے' مگر ساتھ ہی وہ یہ اعتراف بھی کرتا ہے کہ "اگرچہ رسمی قانون اور مضبوط سیاسی اور معاشی ادارے نہایت اہم ہیں' تاہم وہ بذات خود ایک کامیاب جدید معاشرے کی ضمانت دینے کے لیے کافی نہیں" (ص ۱۱)۔

اسے اعتراف ہے کہ اگرچہ امریکہ کا آئین' چرچ اور ریاست کی تفریق پر اساس رکھتا ہے' تاہم امریکہ کے ابتدائی نوآبادکار' جن کی اکثریت برطانیہ سے آئی تھی' پروٹسٹنٹ کلچر کے زیر اثر تھے' جنھوں نے معاشرے کو رضاکارانہ بنیادوں پر قائم ہونے والی انجمنوں کے تحت استوار کیا' اور اس طرح ایک اجتماعی' جمہوری کلچر وجود میں آیا۔ اس کے برخلاف اسپین اور پرتگال میں شاہی اور لاطینی کیتھولک روایت کے تحت' ریاست اور چرچ کے مضبوط اداروں کو پروان چڑھنے کا موقع ملا اور اس طرح آزاد جمہوری "رضاکار" اداروں کو فروغ نہ مل سکا۔

لیکن اب امریکہ اور دوسرے جمہوری ملکوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ان رسمی قانونی اداروں کی ساخت میں کسی ایسی قوت جاذبہ کا فقدان ہے' جو انھیں نئی فنیاتی' معاشی اور سماجی تبدیلیوں کے دباؤ کے تحت شکست و ریخت سے بچا سکے۔ "حریت" "فرد کی آزادی" "انتخاب کا حق" "لبرل ڈیموکریسی" "آزاد معیشت"--- اور اس طرح کے رویوں میں خود خرابی کی ایک صورت مضمر ہے۔ یہ رویے جہاں ایک طرف ثقافتی تنوع اور رنگا رنگی کی طرف لے جاتے ہیں' وہاں اخلاقی اور سماجی انتشار کے بیج بھی بوتے ہیں۔ "رواداری" بہت اچھی اخلاقی خوبی ہے' لیکن ایک جہت سے دیکھیں تو اسی رواداری کے راستے پر چلتے ہوئے اخلاقی اقدار کے انہدام' اباحیت اور معاشرتی افتراق و انتشار کی منزل بھی بہت دور نہیں رہتی۔ "ایک متحرک' فنیاتی طور پر جدت و اختراع کی حامل معیشت' لازماً مروجہ سماجی رشتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی' کہ یہ بات اس کی فطرت میں ودیعت شدہ ہے" (ص ۱۲)۔ ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ وہ سماجی اقدار' جو

ایک عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی ہیں' اور انھیں خوش اسلوبی سے پورا کرتی ہیں' نئی فنیات اور معیشت کے نئے تقاضوں کا دباؤ برداشت نہیں کر سکتیں' اور انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں۔

ٹیلی وژن اور اس کے قبیلے کے دوسرے برقیاتی ذرائع ابلاغ و اطلاع نے معاشرے میں جس انتشار کا رجحان پیدا کیا ہے' ٹی وی کے اشتہار اور سیریل اس کے غماز ہیں۔ خطرناک کوہ پیمائیوں' کشتی رانیوں' کاروں کی دوڑ' جان جوکھوں کے کام' خطرات میں بے دھڑک کود پڑنے والے لوگوں کے کارنامے' جنھیں سب تحسین اور رشک کی نظر سے دیکھیں--- کون کرتے ہیں؟ فلاں سگریٹ پینے والے' فلاں چائے پینے والے' جو زندگی کی دوڑ میں سب سے آگے ہیں۔ آپ کے لشلشاتے ہوئے بال' آپ کے چمک دار دانت آپ کی ترقی اور مقبولیت کے ضامن ہیں' ان کے لیے فلاں شیمپو اور فلاں ٹوتھ پیسٹ استعمال کیجیے۔ ایک امریکی ٹیلی کمیونی کیشن کمپنی نے ۱۹۹۶ میں اٹلانٹا میں گرما کے اولمپیائی کھیلوں کے موقع پر مضبوط کسرتی جسم والے وہ کھلاڑی دکھائے' جو ایسے کارہاے نمایاں کر رہے ہیں' جو کوئی اور کر ہی نہیں سکتا۔ وہ اونچی عمارتوں کی عمودی دیواروں پر چلتے ہیں' ایک فلک بوس عمارت سے دوسری عمارت کی چھت پر کودتے پھرتے ہیں' پہاڑوں کی چوٹیوں سے ہزاروں فٹ گہری وادیوں میں چھلانگ لگاتے ہیں' اور پھر اسکرین پر پیغام کیا آتا ہے؟ "No limits" (لاقیود)۔ شعوری یا لاشعوری طور پر ان فوق البشر دیوتاؤں کے امیج سے یہ بات وابستہ کر دی جاتی ہے کہ ان کے لیے کوئی ضابطہ نہیں' کوئی قیود نہیں۔ اگر آپ ان جیسا بننا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی ساری حدود و قیود کو توڑ دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ پیغام یہ ہے کہ پرانے ضابطے طاقت ور نئی نسل کے ہاتھوں ٹوٹ رہے ہیں۔

اس "بربادی" کی ذمہ دار وہ کمپنی ہے' جس نے اس اشتہار کی سرپرستی کی۔ ماقبل انٹرنیٹ پیغام رسانی کے ذرائع اور ٹیلی فونی اجارہ داریاں' ان کے قواعد و ضوابط ازکار رفتہ ہو چکے' بلکہ یہ نقصان دہ پابندیاں ہیں' ان سے چھٹکارا پاؤ۔ انسانی روح ان جکڑبندیوں کو توڑے بغیر آزاد نہیں ہو سکتی' اور اس کے لیے ہم سے مدد لو۔ دیوتاؤں کی طرح آزاد' ہر قانون سے بالا اور سدا خوش رہو۔ تم سے اوپر اور کوئی نہیں ہے۔

فوکویاما کہتا ہے کہ ان اشتہارات کے خالق' شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک نہایت قوی محرک پیدا کر رہے تھے: فرد کو ہر طرح کی گھٹن پیدا کرنے والی' غیر ضروری سماجی قیود و حدود سے آزاد ہونا چاہیے۔ مغرب میں ۱۹۶۰ کے عشرے سے شروع ہونے والے جنسی انقلاب' "حریت نسواں" کی تحریک' مرد اور عورت کے لیے ہم جنسی کی آزادی کی تحریک اسی "آزادی کے مرض" کی علامتیں ہیں' جن کا نعرہ ہے "لاقیود" (فوکویاما' The Great Disruption' ص ۱۳)۔

اگرچہ "لاقیود" کے نعرے کو دائیں اور بائیں' دونوں بازوؤں نے پوری طرح اپنایا' تاہم ان کی

دلچسپیاں مختلف تھیں۔ بائیں بازو والے "لائف اسٹائل" اور سماجی اقدار میں آزاد روی میں زیادہ دل چسپی رکھتے تھے، اور دائیں بازو والوں کی دل چسپی "آزاد معیشت" سے تھی۔ ہر ایک کو اپنی ملکیت رکھنے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ (امریکہ: ہر ایک کو آتشیں ہتھیار کی آزادی)۔ بے قید معیشت ہی مغرب کی لبرل معیشت (آزاد، بے قید معیشت) کی توأم بہن ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ ہر ایک کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی منفعت کی فکر کرے۔ "زیادہ سے زیادہ نفع"۔ اس پر کسی قدغن اور پابندی کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ "مسابقت" اور "منافع" یہ دونوں الفاظ مغربی نظام کی روح قرار پائے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور ہی میں اس تغیر کو "فرد کی آزادی" سے تعبیر کیا گیا۔ انیسویں صدی میں مغربی دنیا میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں جو تغیرات ہو رہے تھے، "جمہوریت، فرد کے حقوق اور حریت" کا جو غلغلہ وہاں تھا، مشرقی یورپ، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے وسیع خطے بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ جمہوریت کی اس لہر کو سیموئیل ہنٹنگٹن نے "تیسری لہر" کا نام دیا (سیموئیل پی ہنٹنگٹن The Third Wave: Democratization in the Late Twentieth Century، ۱۹۹۱)۔ اور فوکویاما نے اپنی مشہور تصنیف میں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ارتقائے انسانی کے مراحل بس اب ختم ہو چکے ہیں، تاریخ کا اختتام ہو چکا، اور آخری انسان وجود میں آچکا۔ اب کوئی منزل، سر کرنے کے لیے نہیں بچی۔ آزاد جمہوریت (لبرل ڈیموکریسی) اور منڈی کی معیشت (مارکیٹ اکانومی) انسانیت کی معراج ہیں (فوکویاما، The End of History and the Last Man، ۱۹۹۲)۔

مگر ۱۹۹۹ کی اس تازہ تصنیف میں اسے تشویش اس بات پر ہے کہ موجودہ جمہوری نظام، آزادی کے نتیجے میں حد سے متجاوز انفرادیت اور خود غرضانہ رویوں کی طرف لے جا رہا ہے، اور اس کے سب سے واضح مظاہر امریکہ میں نظر آتے ہیں، جو سب سے زیادہ "فرد دوست" جمہوریت ہے (ص ۱۰)۔ آزاد جمہوریت کے پیچھے منطق یہ تھی کہ مختلف النوع اور متضاد قسم کے نظریات اور اخلاقی رویوں میں سے حکومت کو کسی ایک کی پشت پناہی کرنا اور دوسرے کو دبانے کی کوشش کرنا، سیاسی اور سماجی آویزش کا باعث ہوگا، اور اس سے پر امن سیاسی ماحول پروان نہ چڑھ سکے گا۔ اخلاقی اقدار جو خیر اور شر کا تعین کریں، اور مذہب، جو درست اور نادرست، جائز اور ناجائز کا فیصلہ کرنا اپنا حق سمجھتا ہے، انھیں میدان سیاست سے الگ ہی رکھا جائے، کیوں کہ اس طرح ہم بہت سے جھگڑوں اور مناقشوں سے بچ سکیں گے ~

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

(اکبر)

مذہب اور سیاست (چرچ اور اسٹیٹ) کو الگ رکھا جائے۔ ہر ایک کو اپنے مذہبی عقائد رکھنے اور خیروشر کے تصورات (اپنے تک رکھنے) کی آزادی ہے' جب تک کہ دوسرے (اور ریاست) اس سے متاثر نہ ہوں۔ اس طرح "رواداری" کو معاشرے کی اعلیٰ ترین اخلاقی قدر کے طور پر پروان چڑھایا گیا۔

لیکن ایسا معاشرہ جس میں اخلاقی اقدار اور ان کے نتیجے میں ظہور پذیر رویوں میں کوئی اتفاق ہی نہ ہو' انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو جائے گا۔ اس کا علاج ریاستی قوانین اور ان کے ذریعے وجود میں آنے والے ان اداروں کے ذریعے کیا گیا' جن کی پابندی اور احترام ہر شہری کا فرض ہے' اور ان سے اغماض اور تجاوز کو جرم تصور کیا جائے گا۔

فوکویاما کے نزدیک اس طرح وجود میں آنے والے سیاسی نظام کے لیے یہ ضروری نہیں کہ لوگ فضائل اخلاق سے متصف ہوں (یعنی اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل ہوں)۔ بس اتنا کافی ہے کہ وہ اس قدر عقل و شعور ضرور رکھتے ہوں کہ یہ سوچیں کہ ہمیں اپنے مفاد میں قانون کی پابندی کرنی چاہیے' بصورت دیگر نقصان ہمارا ذاتی ہی ہو گا۔ اسی طرح منڈی کی معیشت والی سرمایہ داری نے' جو اس سیاسی آزاد روی کے قدم بہ قدم چل رہی ہے' دولت کی پیدایش اور تقسیم کے سلسلے میں یہ فلسفہ پیش کیا کہ ہمیں اپنے مفاد میں وہ پالیسی اختیار کرنا چاہیے جو اپنی غایت کے اعتبار سے سودمند ثابت ہو۔ یعنی سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو فوراً ذبح کر دینے کے بجائے عرصۂ دراز تک اس سے فائدہ اٹھانا بہتر رہے گا (۱)۔

خود غرضی کی اس منطق سے وجود میں آنے والے معاشرے بہت پھلے پھولے' اور فوکویاما اپنی متعدد تحریروں میں انھی کو انسانیت کی آخری منزل قرار دیتا ہے۔ تاہم مغرب کے بعض دانش وروں نے بھی اس انفرادی آزادی کے کچھ ایسے مضمرات دیکھے ہیں جو تشویش ناک ہو سکتے تھے۔ کیا قانون شکنی ہی واحد قانون کے طور پر رہ گئی ہے؟

اخلاقی اقدار اور سماجی ضوابط کو فرد کی آزادی پر بے جا مسلط کردہ پابندی تصور کرنا درست نہ ہو گا۔ کسی بھی متوازن اور ہم آہنگ معاشرے کے لیے کچھ پابندیاں ضروری ہوتی ہیں' تاکہ اس کے افراد میں تعاون کی راہیں متعین ہو سکیں۔ معاشرے کے اس مشترک نظام اقدار کو آج کے بعض علمائے سماجیات نے "سماجی سرمائے" (social capital) کا نام دیا ہے۔ "مادی سرمائے" (physical capital) جیسے زمین' عمارات' مشینیں اور "انسانی سرمائے" (human capital) یعنی مہارتیں' صلاحیتیں اور علم--- کی طرح یہ سماجی سرمایہ بھی دولت کی افزایش میں ایک اہم عامل ہے' اور قومی معیشت میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی معاشرے کے افراد کو باہم جوڑتا ہے' انھیں افتراق و انتشار سے بچاتا ہے' اور خاندان سے لے کر سیاسی مجالس تک میں ان کے اجماع اور باہمی افہام و تفہیم اور ابلاغ کا باعث ہوتا ہے۔ سماجی نیکیاں یا اخلاق فاضلہ

جیسے صدق و صفا' دیانت و امانت' امداد باہمی' ایفاے عہد' محض اس لیے مستحسن نہیں کہ یہ اخلاقی اقدار ہیں' ان کی خالص مادی قدر وقیمت بھی ہے' جسے سکوں کی تعداد میں ناپا جا سکتا ہے۔ ان اقدار کے عامل گروہ ایک دوسرے پر اعتماد اور تعاون کے ذریعے اپنے مشترکہ مقاصد آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے برعکس انفرادی آزادی' فرد کے حقوق اور انفرادیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کا نتیجہ اجتماع کے زوال کا باعث بنتا ہے۔ معاشرہ مشترکہ اقدار' اجتماعی ضمیر' اور اجتماعی آرزوؤں' امنگوں اور مقاصد سے وجود میں آتا ہے۔ یہ مشترک اقدار اور مقاصد جتنے مضبوط ہوں گے' معاشرتی بندھن بھی اسی قدر مستحکم ہوں گے' اور افراد کے درمیان یک جہتی کا احساس بھی اتنا ہی گہرا اور مضبوط ہوگا۔ اب صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ مغربی معاشرے میں لوگ جب اجتماعی بندھنوں سے آزاد ہونے لگے' تو انھیں ایسے رشتوں کی تلاش ہوئی' جو انھیں جوڑ کر رکھیں۔ لیکن اس طرح کے اختیاری رشتے نہایت ناپایدار ثابت ہوئے۔ ماں باپ اور اولاد کا رشتہ' جس کے استحکام پر اسلام سب سے زیادہ زور دیتا ہے مغرب میں بہت کمزور ہو چکا ہے۔ اسی طرح روایتی ازدواجی تعلق کے بجائے "ساتھ رہنے" کا رواج بڑھتا جا رہا ہے' جس میں فریقین "آزاد" ہوتے ہیں کہ جب تک چاہیں ساتھ رہیں' اور جب چاہیں علاحدہ ہو جائیں (انتشار عظیم' ص ۴۱)۔ اسلام نے اگرچہ طلاق / خلع کے ذریعے ازدواجی تعلق کو ختم کر دینے کی اجازت دی ہے' تاہم اس اختیار کو انتہائی ناگزیر حالات ہی میں استعمال کرنے کے لیے کہا گیا ہے' اور طلاق کو جائز امور میں انتہائی ناپسندیدہ تصور کیا گیا ہے۔ مغرب میں یہ رشتہ بہت ہی کمزور ہو چکا ہے۔

اسی طرح اسلام ہم سائیگی کے تعلق کو نہایت مضبوط بناتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ہم سائے کے حقوق کے بارے میں اتنی تاکید کی گئی کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ اسے وراثت میں شریک نہ بنا دیا جائے۔ گویا اس کے حقوق قریب قریب وہی ہیں' جو عزیزوں اور قرابت داروں کے ہیں۔ لیکن بڑے صنعتی معاشروں اور عظیم الجثہ شہروں کے ظہور میں آنے سے "ہم سائیگی" کا تصور فنا ہوتا جا رہا ہے۔ بڑے شہروں میں کوئی کسی کو نہیں جانتا' لوگوں کو پتا نہیں کہ ان کے آس پاس کون رہتے ہیں' کیا کام کرتے ہیں اور ان کے مسائل کیا ہیں۔ مشینی انداز کی زندگی' جس کا بیشتر حصہ کام کی جگہ پہنچنے اور پھر گھر واپس آنے میں صرف ہو جاتا ہے' آدمی کو اس قابل نہیں چھوڑتی کہ وہ اپنے محلے کے معاملات میں دل چسپی لے' اور محلہ داروں سے سماجی تعلقات استوار کرے۔ مغرب میں عبادت گاہوں میں حاضری بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ بہت سے چرچ "براے فروخت" ہیں' اور اس طرح یہ "مذہبی بندھن" جو ایک جگہ جمع ہونے والوں کے لیے باہمی رابطے اور استواریِ تعلق کا باعث بن سکتا تھا' بہت کمزور پڑ چکا ہے۔

فوکویاما اعتراف کرتا ہے کہ وہ معاشرہ' جو پسند و اختیار کی انفرادی آزادی کو حرز جان بنائے ہوئے ہے'

اور اس کے لیے اقدار اور قواعد و ضوابط کو تج دینے' اجتماعی مفاد کو نظرانداز کر دینے اور اپنی ذات ہی کو محور بنا لینے کا رجحان رکھتا ہو' انتشار' بے ترتیبی اور علیحدگی پسندی کا شکار ہو جائے گا' اور مشترک مقاصد کے حصول اور ان کے لیے جدوجہد کا اہل نہیں رہے گا۔ وہ معاشرہ' جو اپنی فنیاتی اور تکنیکی اختراع اور تازہ کاری (technological innovation) میں "لاقیود" کا نعرہ لگاتا ہے' ذاتی رویوں کی بہت سی صورتوں میں ہرقیدوبند سے آزاد ہو جانے کا رجحان رکھتا ہے' اور اس کے نتیجے میں مآل کار جرائم میں اضافے' خاندان کی ٹوٹ پھوٹ' والدین کا اپنے بچوں کی ذمہ داریوں سے دست کش ہو جانا' ہم سایوں کی باہمی بے اعتنائی اور عدم دل چسپی' اور شہریوں کا عوامی مسائل سے لاتعلق ہو جانا بھی وہ اثرات ہیں' جو واقع ہو کر رہتے ہیں (ایضاً' ص ۷)۔

امریکہ اور مغربی دنیا کے اس انتشار عظیم میں اس "سماجی سرمائے" کے انحطاط کا کس قدر دخل ہے' جس کا تذکرہ ہم اوپر کر آئے ہیں؟

رابرٹ پٹنام کے خیال میں ۱۹۶۰ کی دہائی سے امریکہ میں اس سماجی سرمائے کا زبردست انحطاط واقع ہوا ہے۔ اور اگر صورت حال واقعی یہی ہے تو یہ انسانی افلاس یقیناً اسے تیزی سے زوال کی گہرائیوں میں پہنچا کر رہے گا' سوائے اس کے کہ اس کا بروقت مداوا کیا جا سکے۔

مروجہ عمرانیاتی طریق تحقیق کے مطابق فوکویاما نے سماجی سرمائے کے اس مسئلے کو بھی شماریاتی پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کی ہے۔ جرائم کی صورت حال کیا ہے؟ کیا فی الواقع خاندان ٹوٹ رہے ہیں؟ باہمی اعتماد میں کمی آئی ہے؟ ان سوالات کے جواب اثبات میں ہیں' اور ان کی تفصیلات یقیناً نہایت دل چسپ اور چشم کشا ہیں' خاص طور پر ان ملکوں (اور افراد) کے لیے جو مغرب' خصوصاً امریکہ کی "ترقی" سے خیرہ چشم ہیں' اور اسی کو اپنا مثالیہ اور ہدف بنائے ہوئے ہیں' اس کے محصلات تک پہنچنے کے لیے جدوجہد جن کی غایت بن چکی ہے۔

تاہم سماجی سرمائے کے اس انحطاط اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے اس زوال کو' جس کی طرف مغرب کشاں کشاں پوری انسانیت کو اپنی رہنمائی میں لے جا رہا ہے' فوکویاما انسانیت کا آخری مقدر تسلیم کر لینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سماجی اقدار کی تباہی کے بعد لازمی طور پر ان کی تعمیرنو کا ایک نیا سامان پیدا ہوتا ہے۔ اور اسے اس کے آثار نظر بھی آ رہے ہیں۔ اس کے خیال میں ایسا ہونا لازمی بھی ہے۔ انسان' بنیادی طور پر ایک سماجی مخلوق ہے۔ انسانوں کی بنیادی جبلتیں اور محرکات انھیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں' اور اس کے لیے کچھ اخلاقی قواعد و ضوابط تشکیل دیں' جو انھیں باہم جوڑ کر رکھیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ انسان ایک عاقل مخلوق ہے' اور یہ اس کی عقل ہی ہے'

جو اسے اپنی نوع کے دوسرے افراد سے تعاون کے نت نئے طریقے سمجھاتی اور بجھاتی ہے (ایضاً' ص ۲۷۹' ۲۸۲)۔ تاہم انسان کو اپنی نجات کے لیے اپنی عقل' فہم اور تجربات سے ماورا کسی اور مابعد الطبیعاتی یا مذہبی ہدایت اور رہنمائی کی طرف دیکھنے اور رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔

دراصل موجودہ غالب مغربی فکر' جس کی اساس مادیت' لادینیت اور حواس و عقل کی غیر مشروط اطاعت' حصول مسرت اور نفع عاجل اور خود سے برتر کسی قوت کی نفی پر ہے' اپنی ان نام نہاد محکم بنیادوں سے ماورا کسی حقیقت کی قائل ہی نہیں۔ مذہب' اس کے نزدیک ہدایت وحی کا نام ہے' اور اللہ' ایک وجود موہوم ہے۔ وہ اس کی طرف پیش قدمی کے لیے تیار نہیں بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں' حضرت ابراہیمؑ کے برعکس وہ یہ ادعا کرتی ہے کہ میں نے اپنے آبا کا مذہب ترک کر دیا' اور اس سائنس' ٹکنالوجی اور ترقی کا مذہب اختیار کر لیا ہے' جو مجھے ایسے گلشن بے خار کی طرف لے جائے گا' جہاں نہ احتیاج ہے نہ خوف' نہ کوئی پابندی ہے نہ قدغن۔ مگر اس راستے کی یہ محض ایک ممکنہ / مفروضہ منزل ہے۔ دوسری ممکنہ منزل وہ ہے' جس کی طرف کچھ دوسرے اصحاب فکر اشارہ کر رہے ہیں' یعنی ایسی اتھاہ گہرائی جس کی تاریکی اور عمق ہی سے جھرجھری آجاتی ہے۔ برطانوی جریدے اکانومسٹ کے ایک مضمون نگار نے "sui genocide" (اجتماعی خودکشی) کے عنوان سے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ مآل ہے اس "تخلیقی تخریب" اور بربادی کا جو انسان خود پر مسلط کیے جا رہا ہے (اکانومسٹ' ۱۹ دسمبر ۱۹۹۸)۔

حواشی

۱۔ "سماجی سرمائے" کی اصطلاح پہلے پہل لیڈا جوڈسن ہنی فن (Lyda Judson Hanifan) نے ۱۹۱۶ میں دیہی مدارس کے اجتماعی مراکز کے لیے استعمال کی تھی۔ اس کے بعد کئی علماے عمرانیات نے مختلف انسانی گروہوں کے رویوں کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی۔ ایک مضبوط' باہم مربوط' قانون کا پابند معاشرہ' جس کے افراد ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے' ہمدرد اور وسیع معنوں میں ہم عقیدہ ہوں' ایک مہذب معاشرہ ہو گا۔ ان خصوصیات کے بغیر حقیقی جمہوریت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ایک مہذب جمہوری معاشرے کی تشکیل کے لیے بھی "سماجی سرمائے" کی وافر مقدار کی ضرورت ہو گی۔ کسی بھی ملک یا معاشرے کی ترقی کے لیے محض مادی وسائل کافی نہیں:

قوم کا سرمایہ اے صاحب نظر — دولت و حشمت نہیں' نہ سیم و زر
دولت اس کی' اس کے بچے تندرست — محنتی' فرماں بر و ہشیار و چست

(محمد اقبالؒ / محمد سلیم عبداللہؒ)

چیچنیا: جہاد آزادی کا پس منظر

زیلم خان پاندربے ○

چیچنیا کی موجودہ تحریک آزادی کا آغاز علمی و ادبی حلقے سے ہوا۔ مجھے ایک ادیب اور شاعر ہونے کے ناطے علمی و ادبی حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا اور آپس کی گفتگو میں روسی مظالم اور چیچن قوم کی تہذیب و تمدن' ثقافت اور اسلامی تشخص جسے روس مٹانے پر تلا ہوا تھا' موضوع بحث بنتے رہے۔ یہی وہ فکر' سوچ اور جذبہ تھا جس نے ہمیں آگے بڑھ کر اپنی ثقافت کے تحفظ اور اسلامی تشخص کو اجاگر کرنے' اور آزادی کے لیے جدوجہد کرنے پر ابھارا۔

میں یونین آف رائٹرز فورم کا ممبر تھا اور ہمیں شاعری' نثر اور دیگر ادبی کتب کی تیاری اور اشاعت کا کام کرنا ہوتا تھا۔ اس فورم کے تحت اشتراکی نظریات کے پرچار کے لیے لٹریچر تیار کیا جاتا تھا۔ ہم نے شاعری' نثر اور دیگر ادبی اصناف میں اشتراکی نظریات کی آڑ میں چیچن انگش قوم کی تاریخ حریت' ثقافت' تہذیب و تمدن اور ملی شعور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ وطن سے محبت' حریت فکر' سچائی' دیانت داری اور عزت سے جینے اور آزادی کی سوچ دینے کی کوشش کی۔ اس میں اشتراکی نظریات کا پرچار بھی ہوتا تھا مگر یہ سب راہ ہموار کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔

اس لٹریچر کے نتیجے میں چیچن قوم میں آزادی اور قومی تشخص کے لیے ایک تڑپ پیدا ہونے لگی۔ یہ ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ آہستہ آہستہ یونین آف رائٹرز فورم سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنتا چلا گیا۔ ہم چونکہ یہ کام بہت محتاط طریقے سے کر رہے تھے اس لیے ایک مدت تک کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کو ہماری سرگرمیوں کا پتا نہ چل سکا۔ پھر حکومت کو کچھ شبہ ہوا تو اس نے اقدامات اٹھانا شروع کیے اور کے جی بی کے ذریعے کارروائیاں بھی کی گئیں۔

ہماری اس جدوجہد کے نتیجے میں عوام میں یہ سوچ جڑ پکڑنے لگی کہ کمیونسٹ پارٹی چیچن قوم کی دشمن

○ سابق صدر جیچن جمہوریہ اچکیریا

ہے۔ یہ چیچن تہذیب و ثقافت اور ملی تشخص کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ یہی سوچ قومی سوچ کا رخ اختیار کرتی چلی گئی۔ اس طرح سے یہ کوشش قومی تشخص اجاگر کرنے کا ذریعہ بن گئی۔ اس وقت ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ کام سیاسی بیداری کا ذریعہ بن جائے گا۔ ہمیں اس کی زیادہ توقع نہ تھی۔ ہماری توقع سے بڑھ کر کام ہو گیا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ ۱۹۷۹ میں براہ راست حکومت اور چیچن انگش تصادم شروع ہو گئے۔

۱۹۸۹ میں گوربا چوف کی گلاس ناسٹ اور پرسٹرائیکا اصطلاحات کے نتیجے میں کچھ سیاسی آزادی میسر آئی۔ سیاسی جماعتیں بنانے کی آزادی بھی مل گئی۔ چنانچہ ۱۹۸۹ میں ماسکو سے واپسی پر میں نے وائی ناخ ڈیموکریٹک پارٹی کی بنیاد ڈالی جسے ہم لوگ وائی ناخ جماعت کہتے تھے۔ پارٹی کے بنیادی مقاصد چیچن انگش قوم کو روس سے علیحدہ کرنا' آزادی حاصل کرنا اور اسلامی جمہوری نظام کا نفاذ تھے۔

۱۹۹۰ تک یہ صورت حال تھی کہ چیچنیا کے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ۷۰ فی صد تک روسی قابض تھے اور باقی ۳۰ فی صد پر چیچن انگش تھے۔ اس سے چیچن قوم میں روس سے نفرت پیدا ہو گئی اور ظلم و ستم کا احساس شدت پکڑنے لگا۔

۱۹۵۸ میں جلاوطنی کے بعد جب ہم لوگ واپس اپنے وطن آئے تو گروزنی شہر میں ہمارے خلاف مظاہرے ہوئے کہ ہمیں نکالا جائے اور واپس بھیجا جائے۔ مظاہرین درپردہ روسی تھے۔

۱۹۷۳ میں انگش قوم کے جو علاقے واپس نہیں کیے جا رہے تھے ان کے لیے مظاہرے شروع ہوئے۔ مظاہرین پر لاٹھی چارج کیا گیا' گرم پانی پھینکا گیا اور دیگر حربے استعمال کیے گئے۔ اس طرح سے یہ ظلم و ستم کا سلسلہ چلتا رہا۔ عالم یہ تھا کہ جو بھی ادیب یا شاعر روس کے خلاف بات کرتا اسے ستایا جاتا اور نوکری سے بھی نکال دیا جاتا۔ ۱۹۹۰ تک کوئی بھی چیچن' انگش باشندہ اس ریاست کا سربراہ یا کسی نمایاں عہدے پر تعینات نہیں تھا۔ اگر کوئی چیچن نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی ریاست میں نوکری کرنا چاہتا تو اسے یہاں ملازمت نہ دی جاتی بلکہ روس بھیج دیا جاتا تھا تاکہ روسی ثقافت میں ضم ہو جائے اور قومی تشخص نہ ابھر سکے۔ حتیٰ کہ جو نوجوان ۱۰' ۱۵ سال کی ملازمت کے بعد بھی چیچنیا اپنی ریاست میں واپسی یا تبادلے کے لیے کہتے تو ان کا تبادلہ نہ کیا جاتا' اور ان کے بجائے روسی افسر نامزد کیے جاتے۔ اگر نوجوان اپنی ثقافت' روایات' اسلامی تشخص کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے تو انھیں نوکری سے نکال دیا جاتا اور جیل بھیج دیا جاتا۔ یہ سب ظالمانہ اقدامات چیچن قوم کے تشخص کو مٹانے اور ان کی آزادی کی تحریک کو دبانے کے لیے کیے جاتے رہے۔ یہ ان مظالم کی ایک معمولی جھلک ہے جو روسی' چیچن قوم پر ڈھاتے رہے۔

تمام تر مظالم کے باوجود روسی' چیچن عوام کے دل سے جذبہ جہاد اور آزادی کی تڑپ نہ نکال سکے۔ چیچن لوگ کس قسم کے عزم و ہمت کے مالک ہیں اور روسی ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اس کا

اندازہ اس سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے کہ روس میں جبری فوجی ملازمت کے دوران چیچن نوجوان روسی افسروں سے قطعاً نہ ڈرتے تھے بلکہ اپنے رعب و دبدبے سے ان سے اپنے کپڑے حتیٰ کہ موزے تک دھلوا لیا کرتے تھے' چاہے اس کے نتیجے میں انھیں کتنی ہی سزا کیوں نہ بھگتنا پڑتی۔ یہ بات مشہور تھی کہ ایک فوجی دستے میں دو چیچن نہیں ہونے چاہییں' ایک ہی بہت ہوتا ہے۔ اگر کسی دستے میں دو چیچن سپاہی ہو جاتے تو وہ سب پر حاوی ہو جاتے۔ شاید روس کے موجودہ وزیراعظم سے کسی چیچن نے ایسا ہی سلوک کیا ہو جو وہ آج بدلہ لے رہا ہے!

چیچنیا کی تحریک آزادی اسی طرح آگے بڑھتی رہی۔ ہم نے کبھی روسی قانون کو تسلیم نہیں کیا۔ ہمارے علاقوں میں اپنا قانون تھا۔ ہم نے اسلامی شریعت نافذ کر رکھی تھی۔ جو بھی روسی قانون ہوتا ہمارے قبائل اسے شریعت کے مطابق پاتے تو قبول کر لیتے وگرنہ رد کر دیتے تھے۔ گویا ہماری قوم نے روسیوں اور روسی نظام کو ذہنی طور پر کبھی بھی قبول نہ کیا اور نہ ہی تسلیم کیا۔

اس تحریک کو وائی ناخ جمہوری پارٹی کنٹرول کرتی رہی۔ پھر وہ مرحلہ بھی آیا کہ جہاں کہیں کسی روسی نے کسی چیچن پر ظلم کیا' کسی عورت سے بدسلوکی کی گئی تو لوگ گھروں سے نکل آتے' مظاہرے کرتے' اور حکومت کے خلاف نعرے لگاتے اور انتظامیہ کے ساتھ تصادم بھی ہوتا۔ اس طرح بہ تدریج یہ تحریک ایک قومی تحریک میں بدل گئی۔ پوری قوم کی ایک ہی آرزو تھی کہ روس سے نجات اور آزادی حاصل کی جائے۔

نومبر ۱۹۹۰ میں وائی ناخ ڈیموکریٹک پارٹی نے پوری چیچن قوم کی نمایندگی کے لیے نیشنل کانگرس بلائی۔ اس میں حکمران پارٹی کے لوگ بھی شریک ہوئے۔ کانگرس میں چیچنیا کو ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کرنے کی قرارداد منظور کی گئی۔ حکومت نے بھی قومی دباؤ کے پیش نظر اس قرارداد کی تائید کی اور چیچنیا کو آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ انھیں خدشہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو قوم اٹھ کھڑی ہو گی۔ ماسکو نے اس فیصلے پر تنقید تو کی لیکن کوئی ایکشن نہ لیا۔ ان کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ بات دب جائے گی۔

ایک سال کے اندر اندر چیچن عوام کے دباؤ میں اس قدر اضافہ ہوا کہ حکومت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ حکومت نے آزادی کا اعلان تو کیا تھا مگر وہ چال بازی کر رہے تھے اور ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ عملاً حکومت نیشنل کانگرس کے ہاتھ آگئی تھی۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۱ کو چیچن انگش پارلیمانی اور صدارتی انتخاب ہوئے۔ اس کے بعد انگش باشندوں نے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔ وہ روسی حکومت کے تحت ہی رہنا چاہتے تھے۔ ہم نے بھی انھیں مجبور نہ کیا۔ اس طرح سے پہلی چیچن پارلیمنٹ وجود میں آگئی اور جوہر داؤد صدر بن گئے۔ اس وقت میں پارلیمنٹ کا رکن تھا۔ پھر ۱۹۹۳ میں مجھے نائب صدر کے لیے چن لیا گیا۔

ان انتخابات کے بعد روس سے کئی بار بات چیت' مذاکرات ہوئے اور آزادی کی بات ہوئی۔ یورپ کے کچھ ممالک مثلاً فن لینڈ' جارجیا' آرمینیا' لتھونیا' اسٹونیا وغیرہ بھی ہماری آزادی کے حق میں تھے۔ یہ انتخابات بین الاقوامی معیار کے مطابق ہوئے تھے اور پوری قوم کی طرف سے آزادی کا واضح مطالبہ تھا۔ اسی بنا پر ہم نے اقوام متحدہ اور دیگر ممالک سے درخواست کی کہ وہ ہماری آزادی کو تسلیم کر لیں۔ اقوام متحدہ کو ۶۷ مختلف دستاویزات بھیجی گئیں کہ وہ ہماری آزادی اور قانونی حیثیت کو تسلیم کریں' جب کہ ۱۲ مارچ ۱۹۹۲ کو چیچن پارلیمنٹ سے ملک کا دستور بھی منظور کیا جا چکا تھا۔ خاص طور پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ آزادی سیاسی طور پر حاصل کی گئی تھی۔ کسی جنگ و جدل یا غیر سیاسی ہتھکنڈوں کے ذریعے حاصل نہیں کی گئی تھی۔

جون ۱۹۹۲ میں چیچنیا سے تمام روسی افواج کو نکال باہر کیا گیا۔ یہ ایک تاریخ ساز واقعہ تھا کہ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ سوویت یونین کی کسی ریاست سے یا دنیا کے کسی ملک سے روسی فوجوں کو اس طرح سے نکالا گیا ہو۔ اس کے بعد پھر دیگر بالٹک ریاستوں سے روسی فوجیں نکلی تھیں۔ اس دوران روس سے کئی بار مذاکرات ہوئے جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ آئینی اور دستوری لحاظ سے ہمیں ایک دوسرے کو تسلیم کر لینا چاہیے مگر روس اس کے لیے تیار نہ تھا۔

چیچنیا کی آزادی کے بعد روس نے ہماری آزادی کو تسلیم کرنے کے بجائے سازشیں شروع کر دیں۔ کے جی بی کے ذریعے دہشت گردی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ ہماری اہم تنصیبات کو دھماکوں سے اڑایا گیا۔ جوہرداؤد پر کئی مرتبہ قاتلانہ حملے ہوئے' جن میں ہمارے کئی وزیر ہلاک ہو گئے۔ مجھ پر بھی حملہ کیا گیا۔ روس تخریب کاری اور دہشت گردی سے اس ریاست کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے چیچن باشندے اور اپنے تخریب کار بھی استعمال کیے۔ روسی حکومت نے کئی مرتبہ حکومت کا تختہ الٹنے کی کوششیں کیں لیکن ہر دفعہ ان کو ناکامی ہوئی۔ روس نے سیاسی طور پر انتشار پھیلانے کی کوشش بھی کی اور ایک مصنوعی اپوزیشن گروپ اسمبلی میں بنا کر اپنے مقاصد پورے کرنا چاہے۔ جب ان تمام کوششوں میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو ۲۶ نومبر ۱۹۹۴ کو ریگولر آرمی کو چیچن باشندوں کے لباس اور بہروپ میں چیچنیا میں داخل کر دیا۔

گروزنی پر یہ حملہ صبح سویرے کیا گیا مگر دوپہر تک اس حملے کو پسپا کر دیا گیا۔ تقریباً دو سو فوجی گرفتار کیے گئے۔ ۶۰ حملہ آور ٹینکوں میں سے ۱۰ صحیح سلامت پکڑ لیے گئے اور باقی تباہ کر دیے گئے۔ اس ناکامی کے بعد روس نے اسے تختہ الٹ دینے کی اندرونی سازش قرار دیا۔ اس پر ہم نے گرفتار روسی فوجیوں کو ٹی وی پر دکھایا اور ان کی تصاویر جاری کر دیں۔

اس سازش کے بے نقاب ہو جانے پر اور عالمی سطح پر شرمندگی سے بچنے کے لیے روس نے مختلف روسی سیاسی لیڈروں اور جماعتوں کے ذریعے درخواست کی کہ گرفتار فوجیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ مذاکرات کے نتیجے میں روسی حکومت نے وعدہ بھی کیا کہ آیندہ حملہ نہیں کیا جائے گا۔ مگر جیسے ہی قیدی واپس کیے گئے روس وعدے سے پھر گیا۔ چیچن فوج کو ہتھیار ڈالنے اور روس کے وفاق کا پابند رہنے کو کہا گیا اور حملے کا الٹی میٹم دے دیا۔ بالآخر ۱۱ دسمبر ۱۹۹۴ کو دوبارہ حملہ کر دیا گیا۔ جوہرداود نے مذاکرات کی کئی بار کوشش کی' اقوام متحدہ اور دیگر اداروں کو روسی جارحیت پر متوجہ کیا مگر بے سود رہا۔ اس جنگ میں ایک لاکھ ۲۰ ہزار چیچن باشندے کام آئے' جب کہ مکانات' عمارات اور ہسپتال تک تباہ و برباد کر کے رکھ دیے گئے۔

جوہرداود کی شہادت کے بعد صدارت کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ ۲۷ مئی ۱۹۹۶ کو ماسکو میں صدر یلسن اور میرے درمیان عالمی پروٹوکول کے مطابق مذاکرات ہوئے' جس کے نتیجے میں یہ بات طے پائی کہ لڑائی بند کی جائے۔ یہ مذاکرات یورپی یونین کی کوششوں سے ممکن ہوئے تھے۔ کچھ دن کے امن کے بعد روس نے اپنے تمام تر وعدوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پھر لڑائی شروع کر دی۔ اس دوران ہم نے چیچنیا میں اسلامی نظام شریعت بھی نافذ کر دیا۔ روس نے گروزنی پر ایک بار پھر قبضہ کر لیا۔ روس نے ایک ماہ سے زائد مدت میں یہ قبضہ کیا تھا مگر کچھ عرصے بعد ہم نے صرف ایک گھنٹے کے اندر اندر گروزنی آزاد کروا لیا۔ یورپی یونین کے تعاون سے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۶ کو ایک بار پھر روس اور چیچنیا کے درمیان مذاکرات ہوئے جس کے نتیجے میں روس کو اپنی فوج نکالنا پڑی۔ معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ چیچنیا میں ازسرنو انتخاب کروائے جائیں تاکہ ایک منتخب حکومت بنے جسے روس تسلیم کرے گا۔ روسی حکومت گذشتہ انتخابات کے نتیجے میں بننے والی حکومت کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔

جنگ کی تباہی کے بعد انتہائی کٹھن حالات میں انتخابات کا انعقاد ممکن نہیں ہوتا مگر ہم نے امن کی خاطر نئے انتخابات بھی کروائے۔ یہ انتخابات چیچنیا کے دستور کے تحت ہوئے تھے جنھیں دنیا بھر میں تسلیم کیا گیا۔ ان آزاد انتخابات کا روس سمیت عالمی اداروں اور یورپی نمایندوں کی ایک بڑی ٹیم نے براہ راست مشاہدہ کیا اور منصفانہ قرار دیا۔ روسی حکومت نے ارسلان مسخادوف کو باقاعدہ صدر بننے پر مبارک باد دی۔ اس کے بعد یلسن اور ارسلان مسخادوف کے درمیان ماسکو میں مذاکرات ہوئے جس کے تحت ایک معاہدہ امن پر دستخط بھی ہوئے۔ یہ معاہدہ ۱۲ مئی ۱۹۹۷ کو ماسکو میں ہوا۔ اس طرح سے قانونی طور پر یہ بات واضح ہو گئی کہ روس نے چیچنیا کو تسلیم کر لیا ہے۔

اس لحاظ سے اگر آئینی' دستوری اور دنیا کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو روسی فوجوں کے انخلا کے بعد چیچنیا کے دستور کے تحت منصفانہ انتخابات کا ہونا جنھیں روس نے عالمی سطح پر تسلیم کیا ہو'

اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ چیچنیا ایک خودمختار اور بااختیار ریاست ہے جسے تسلیم کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ ہم نے اقوام متحدہ اور دیگر مسلم و غیرمسلم ممالک سے درخواست کی کہ چیچنیا کی حکومت کو تسلیم کیا جائے۔ مگر روس نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے درپردہ اپنے سفارت کاروں کے ذریعے مختلف ممالک پر دباؤ ڈالا جنھوں نے روس کے خوف کی وجہ سے ہمیں تسلیم نہ کیا۔

اگر غور کیا جائے تو اس لحاظ سے گذشتہ دس برس سے چیچنیا ایک آزاد اور خودمختار ریاست ہے۔ ہم نے تمام تر جدوجہد آئینی اور قانونی اصولوں کے مطابق کی ہے۔ روس سے متعدد معاہدے بھی کیے ہیں' جن سے وہ پھرتا رہا ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے ممالک ہمیں تسلیم نہ کریں۔ مسلمان ممالک کا تو فرض ہے کہ اس جارحیت اور ظلم و ناانصافی کے پیش نظر ہمیں نہ صرف تسلیم کریں بلکہ ہماری اخلاقی و مادی مدد بھی کریں۔ پاکستان جس کا عالم اسلام میں ایک منفرد مقام ہے' اس سے ہماری خاص طور پر اپیل ہے کہ وہ اپنا کردار ادا کرے اور حکومت پاکستان ہماری حکومت کو تسلیم کرے۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ مسلم ممالک بھی جرات کا مظاہرہ نہیں کر رہے اور امریکہ یا دیگر ممالک سے خوف زدہ ہیں۔

آج امت مسلمہ کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ مختلف سمتوں میں بٹی ہوئی اور منتشر ہے۔ امت کے سامنے کوئی واضح حکمت عملی اور ٹھوس لائحہ عمل نہیں ہے۔ مسلمان حکمران امریکہ' روس یا مختلف طاقتوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں' جب کہ اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کے خلاف متحد ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف کھلی جنگ جاری ہے۔ چیچنیا' بوسنیا' کوسووا' کشمیر' فلسطین' سوڈان اور مشرقی تیمور اس بات کے کھلے ثبوت ہیں۔ یہودی' عیسائی' ہندو سب مل کر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہیں مگر یہ حکمران کوئی سبق سیکھنے کے بجائے الٹا مسلمانوں کے خلاف ان قوتوں کی ہی مادی امداد کر رہے ہیں۔ یہ بات نہایت افسوس ناک ہے۔

اگر یہی مایوس کن صورت حال رہی تو اس بات کا خدشہ ہے کہ جس طرح آج چیچنیا پر جارحیت کی گئی ہے' اگر ایک چیچنیا ختم ہو گا تو دس چیچنیا اور سامنے آئیں گے' ایک کشمیر ختم ہو گا تو کئی کشمیر سامنے آئیں گے' ایک فلسطین ختم ہو گا تو کئی فلسطین سامنے آئیں گے۔ اسلام دشمن قوتیں جو چاہتی ہیں' کر گزرتی ہیں۔ انھیں انڈونیشیا کو کمزور اور تقسیم کرنا تھا تو مشرقی تیمور کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ مسلمان حکمران امریکہ کے آگے سربہ سجود ہیں۔ اگر اس روش کو نہ بدلا گیا تو آپ بہت جلد دیکھ لیں گے قازقستان کے ایک بڑے حصے پر روس قبضہ کر لے گا۔ پاکستان کو بھی بہت سے خطرات کا سامنا ہے۔ اسے بھی کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

آج ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی اس بات کو بہ خوبی سمجھتا ہے کہ مسلمان حکمران

امریکہ' روس اور یورپ کے آگے سجدہ ریز اور ان کے غلام ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں صرف دو ممالک ہی آزاد ہیں' ایک چیچنیا اور دوسرا افغانستان جنھوں نے جرأت مندانہ موقف اپنایا ہے اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دے رہے ہیں۔ دیگر مسلم ممالک میں پاکستان کسی حد تک آزاد ملک ہے۔ عراق روس پر انحصار کرتا ہے' ایران بھی روس کے رحم و کرم پر ہے' جب کہ سعودی عرب اور دیگر مسلم ممالک بھی امریکہ کے زیر اثر ہیں۔

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ہم اس ذلت کا کیوں شکار ہیں؟ یہ اس لیے ہے کہ ہم نے اللہ کے راستے کو چھوڑ دیا ہے۔ رسولؐ اللہ تو ہمارے لیے ایک قرآن اور ایک امت مسلمہ کو چھوڑ کر گئے تھے مگر ہم نے قرآن کو بھی چھوڑ دیا اور امت کے اتحاد کو بھی پارہ پارہ کر دیا۔ یہ ساری ذلت و پستی اسی روش کا نتیجہ ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان متحد ہو کر از سر نو خلافت کے احیا کی کوشش کریں۔ اگر تمام مسلمان ممالک نہیں تو کم از کم چند ممالک بالخصوص پاکستان اور افغانستان باہمی اتحاد سے اس صورت حال کا مقابلہ کریں۔ پاکستان آج ایک ایٹمی طاقت ہے۔ وہ امت مسلمہ کی امامت کا فریضہ بہتر انداز میں ادا کر سکتا ہے۔ پاکستان کو ٹھوس لائحہ عمل اپنانا چاہیے۔ پاکستان اور افغانستان مل کر اسلامی فوج تشکیل دیں اور دنیا پر یہ واضح کر دیں کہ جہاں بھی مسلمانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا سلوک روا رکھا گیا یا جارحیت یا دہشت گردی کی گئی تو ہم اپنے مسلمان بھائیوں کی امداد میں پیچھے نہیں رہیں گے۔ یہ جرأت مندانہ موقف اپنانے کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ پوری امت مسلمہ کی یہ دل کی آواز ہے۔ مسلمان اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ ضرورت صرف عزم و حوصلے کی ہے۔ یہ صرف اللہ پر پختہ ایمان و یقین اور جہاد کا راستہ اپنانے ہی سے ممکن ہو گا۔ جو قومیں سر اٹھا کر چلنے کا عزم رکھتی ہیں وہی دنیا میں جینے کا بھی حق رکھتی ہیں۔ چیچنیا نے اپنے لیے اسی راستے کو منتخب کیا ہے۔

(یہ تحریر ترجمان القرآن کے لیے خصوصی انٹرویو پر مبنی ہے۔ تعاون: اکبر علی محمد ایوب منیر' امجد عباسی)

محکمہ تعلیم (پنجاب) نے ماہنامہ ترجمان القرآن کو صوبہ بھر کے تعلیمی اداروں (اسکول / کالج) کی لائبریریوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے باقاعدہ منظور کر لیا ہے۔ (حوالہ سرکلر نمبر SO (A-IV) 4-45/99' 1255G-III' 14-1-2000' مورخہ ۲۶ جنوری ۲۰۰۰ء)

اخبار امت

الجزائر: خوں ریزی پر تحقیقاتی رپورٹ

امجد عباسی

الجزائر میں ہونے والی سفاکانہ قتل و غارت گری اور خوں ریزی نے جو ۱۹۹۲ سے فوج کے اقتدار میں آنے کے بعد سے مسلسل جاری ہے' الجزائر کو ایک انتہائی اذیت ناک مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ الجزائر کا سرکاری میڈیا اور فرانسیسی میڈیا بالخصوص اور عالمی میڈیا بالعموم عام شہریوں کے رات کے وقت سفاکی سے قتل و غارت کا ذمہ دار اسلامی تنظیموں خاص طور پر مسلح اسلامی گروپ "جی آئی اے" کو قرار دیتا ہے۔

اس خوں ریزی کے حوالے سے متعدد سوالات ہیں۔ اب تک خوں ریزی کے اس طرح کے کتنے واقعات رونما ہو چکے ہیں؟ کل کتنے لوگ ہلاک کیے جا چکے ہیں؟ منظم انداز سے' ایک تواتر سے اور اتنے وسیع پیمانے پر یہ سلسلہ کس طرح سے جاری ہے؟ اس میں ملوث لوگوں کی پناہ گاہیں' وسائل' افرادی قوت اور ہتھیاروں کی فراہمی ان سب کی کیا صورت ہے؟ ہلاک ہونے والوں کی سماجی حیثیت اور سیاسی وابستگی کی کیفیت کیا ہے؟ حملہ آوروں کا طریقہ واردات کیا ہے؟ کون سے ہتھیار استعمال کرتے ہیں؟ اس خوں ریزی کے مرتکب کون ہیں جو ہمیشہ سزا سے بچ جاتے ہیں؟ اسلام پسند' جیسا کہ وسیع پیمانے پر عالمی پریس میں بیان کیا جاتا ہے' یا سرکاری ایجنسیوں کے افراد' جیسا کہ واقفان حال بیان کرتے ہیں۔ "جی آئی اے" میں کون افراد ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ مسلح فوج اپنی بیرک کے قریب ہونے والے خوں ریزی کے واقعات کے دوران اطلاع دیے جانے کے باوجود ہمیشہ مداخلت سے انکار کرتی ہے؟ اس خوں ریزی کے کیا مقاصد ہیں؟ کیا دہشت گردی کے ذریعے اسلامی نظام مسلط کرنا' جیسا کہ سرکاری اور مغربی ذرائع بتاتے ہیں' یا کوئی اور خفیہ مقاصد کارفرما ہیں؟ اس پر الجزائری عوام کا کیا ردعمل ہے؟ حکومت کا کیا موقف ہے؟ عالم اسلام میں اس کا کیا ردعمل ہے' اور مغرب کے انصاف پسند اس پر کیا سوچ رکھتے ہیں۔ کیا اس خوں ریزی کا کوئی تعلق ۱۳۲ سالہ فرانسیسی نوآبادیاتی دور کی خوں ریزی سے بھی ہے؟ الجزائر کا قانون اس خوں ریزی کے بارے میں کیا

ہے؟ اور اس قسم کی سفاکانہ خوں ریزی کے خاتمے کے لیے عالمی قوانین کے تحت کیا اقدامات اٹھائے جاسکتے ہیں؟

یہ اور اسی نوعیت کے بہت سے سوالات جواب طلب ہیں اور بار بار اٹھائے جاتے ہیں۔ بہت کم صحافیوں اور اہل قلم نے گذشتہ تین برسوں میں ان سوالات کو وہ اہمیت دی ہے جو ان کو ملنا چاہیے تھی۔ الجزائر کی فوجی حکومت کی پُرزور ڈس انفارمیشن مہم اور فرانس کی مکمل حمایت کی وجہ سے حقیقت پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ نوام چومسکی کے الفاظ میں "عالمی برادری کے بااثر ممبران کی سچائی کو جانتے ہوئے بھی خاموشی" اس کی وجہ ہے۔

الجزائر' یورپ اور امریکہ کے مغربی (شمالی افریقہ کی) اہل علم کی ایک ٹیم نے' اس مسئلے کا مکمل جائزہ لینے کا فیصلہ کیا اور ڈیڑھ برس کی تحقیق' جدوجہد اور محنت کے بعد ایک معیاری اور جامع تحقیقی رپورٹ پیش کی۔ ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل یہ رپورٹ An Inquiry in to the Algerian Massacres [الجزائر میں قتل و غارت کی تحقیقاتی رپورٹ] کے نام سے شائع ہوئی ہے جسے یوسف بدوئی' عباس آرویا اور میزیان ایت لوربی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں ان تمام سوالات کا مکمل معلومات حاصل کر کے تحقیقی بنیادوں پر جواب دیا گیا ہے۔

دو معروف برطانوی شخصیات نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک نوام چومسکی (Noam Chomsky) جو برطانیہ میں مشرق وسطیٰ اور عالمی سیاست پر ایک معروف تجزیہ نگار ہیں' اور دوسرے لارڈ ایرک ایوبری (Lord Eric Avebury) ہیں جو برطانوی پارلیمنٹ میں ہیومن رائٹس کمیٹی کے نائب صدر ہیں۔ چومسکی نے اس کتاب کو "متاثر کرنے والا گہرا سنجیدہ مطالعہ' اور محتاط عادلانہ تفتیش" قرار دیا ہے۔ لارڈ ایوبری کے مطابق اس نے ثابت کر دیا ہے کہ ان خوف ناک جرائم کا ذمہ دار اسلام پسندوں کو قرار دینے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

کتاب میں نہایت محتاط طریقے پر قانونی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے معلومات جمع کی گئی ہیں۔ واقعات کہاں' کب پیش آئے' اس کے بارے میں ٹھوس ثبوت اور مستند دستاویزات پیش کی گئی ہیں۔ کون لوگ قتل و غارت گری کا نشانہ بنے' وہ فوجی چھاؤنیاں اور پولیس اسٹیشن جن کے قرب و جوار میں قتل ہوئے' کتنی دیر میں پولیس یا فوج موقع واردات پر پہنچی' اہم واقعات' اور اس طرح کے بہت سے پہلوؤں کو اعداد و شمار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

اس طرح سے پہلی مرتبہ اہل مغرب کے لیے بالخصوص اور تمام دنیا کے لیے بالعموم ایسی معلومات سامنے آسکی ہیں جن میں نہ صرف حقائق کو پیش کیا گیا ہے بلکہ اسلام پسندوں پر لگائے گئے الزامات کا بھی

بے لاگ تجزیہ کیا گیا ہے۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو اعداد و شمار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان عناصر کا بھی شواہد کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے جو اس سفاکی میں نمایاں رہے ہیں۔

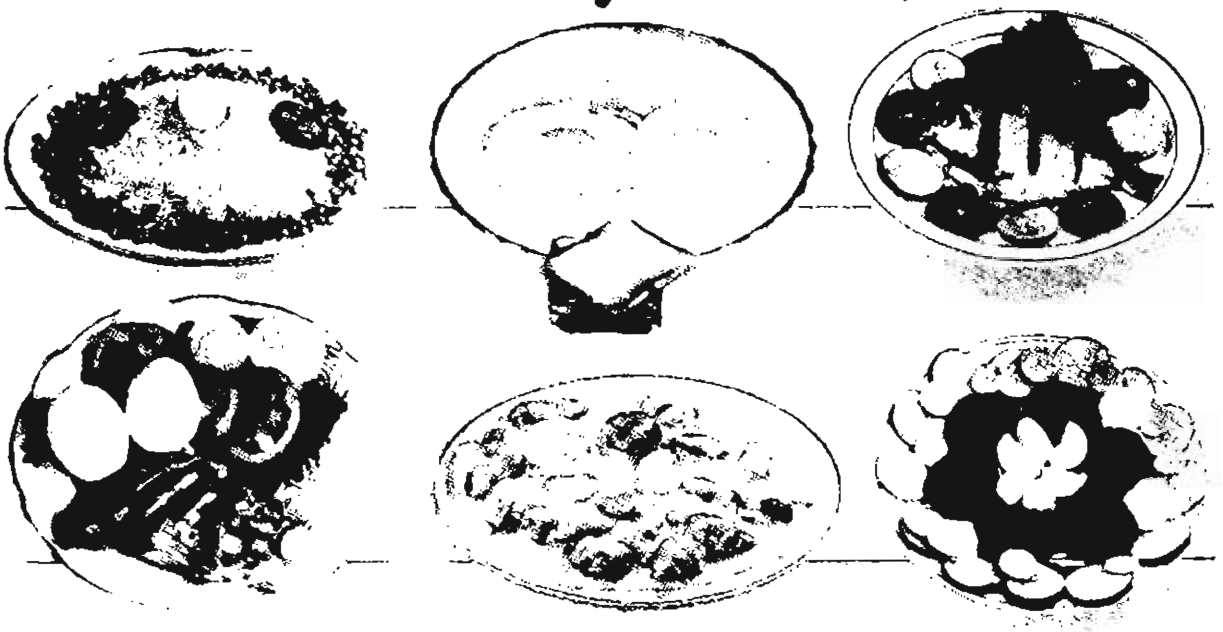
الجزائر میں خوں ریزی سے متعلق اعداد و شمار کے ساتھ، نقشے اور تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ اس ضخیم رپورٹ کے پہلے حصے میں الجزائر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ارتکاب جرم کرنے والوں کے محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے، تیسرے حصے میں ان واقعات پر ہونے والے ردعمل کا جائزہ، حکمران طبقے، سیاسی جماعتوں اور عوام کی آرا کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ چوتھا حصہ بیرونی تنظیموں اور دیگر ممالک کی مداخلت کا اعداد و شمار و دستاویزات کے حوالے سے جائزہ پر مبنی ہے۔ پانچواں حصہ نوآبادیاتی دور میں ہونے والی خوں ریزی کے واقعات پر مشتمل ہے۔ چھٹے حصے میں قانونی پہلو پیش کیا گیا ہے اور ملکی قانون اور بین الاقوامی قانون میں ان جرائم کی سزا اور دیگر نکات اجاگر کیے گئے ہیں۔

خوں ریزی کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ نئے صدر بوتفلیقہ دراصل فوج کے ہی نمایندہ ہیں۔ گذشتہ اپریل میں انتخاب کے بعد پہلی تقریر میں انھوں نے فوج کو بری الذمہ قرار دے کر، سارا الزام اسلام پسندوں پر رکھا۔ انھوں نے تین ہزار غائب ہونے والے افراد اور ان کے اہل خاندان کے مظاہروں سے آنکھیں بند کر لیں۔ ملک کے چیدہ چیدہ باصلاحیت سیکڑوں افراد جو تعذیب خانوں میں ختم ہو گئے، وہ بھی انھیں نظر نہ آئے۔ دنیا بھر کی انسانی حقوق کی تنظیمیں جو مطالبات کر رہی ہیں، ان کے لیے بھی ان کے کان بند ہیں۔ جناب صدر کسی قسم کی تحقیقات کروانے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

لارڈ ایوبری نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں جو ہولناک واقعات بیان کیے گئے ہیں، الجزائر ان پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔ دوسری ریاستیں جب اس طرح کے دور سے گزریں، تو انھوں نے مجرموں کو سزا دینا ضروری سمجھا۔ الجزائر کے عوام کے ضمیر کو اس کے بوجھ سے آزاد ہونا چاہیے۔ حقیقت سامنے آنا چاہیے۔ سات سال کے مظالم کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ اگر صدر بوتفلیقہ کارروائی نہ کریں تو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کو یہ اختیار ہے اور اس کا یہ فرض ہے کہ حقیقت حال کو معلوم کرے اور کارروائی کرے۔

ہم مسلمانوں پر غیروں کے مظالم کا رونا روتے ہیں، ہندو اور یہودی، سرب اور روسی--- لیکن اپنوں کے مظالم کی داستان بھی کم خونچکاں نہیں ہے۔ اگر اخوان المسلمون پر مصر میں کیے جانے والے مظالم کی اس نوعیت کی مستند دستاویز مرتب کی جائے تو ۳ ہزار صفحات بھی کم پڑ جائیں گے۔ اسی طرح شام میں حافظ الاسد، تیونس میں زید بن علی--- کن کن قصائیوں کے نام لیے جائیں--- لیکن یہ کرنے کا کام ہے کہ اس طرح کی رپورٹیں تیار ہوں۔ ہم عالمی ضمیر کو آواز دیتے رہتے ہیں، امت کا ضمیر بھی جگانے کی ضرورت ہے (ماخوذ: مسلم ورلڈ بک ریویو جلد ۲۰، عدد ۲، سرما ۲۰۰۰)۔

اہم یہ نہیں کہ آپ کیا کھاتے ہیں



بلکہ اہم یہ ہے کہ

آپ کتنا ہضم کرتے ہیں



زندہ رہنے کے لیے غذا بنیادی ضرورت سہی لیکن اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ آپ جو کچھ بھی کھاتے ہیں کیا وہ صحیح طور پر ہضم ہو کر جزو بدن بھی ہوتا ہے؟ صحت مند رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم درست رہے۔ کھانے پینے میں احتیاط سے کام لیجیے۔ زود ہضم اور سادہ غذا کھائیے۔ وقت بے وقت کھانے پینے اور پُرخوری سے پرہیز کیجیے۔ اور اگر ہاضمہ خراب ہو جائے تو اس کی اصلاح کے لیے فوری نئی کارمینا استعمال کیجیے۔ ہمدرد کی نئی کارمینا تیزابیت اور گیس کے مریضوں کے لیے بھی بے ضرر اور یکساں مفید ہے۔

خوش ذائقہ نئی کارمینا

معدے کو تقویت دے کر نظامِ ہضم کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔

ہمدرد



مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ

آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعات ہمدرد خریدتے ہیں۔ جائز منافع بین الاقوامی شہر علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

رسائل و مسائل

سسرالی رشتے داروں کے ساتھ طرز عمل

سوال : ہم اپنے گھر میں اپنے والد کا رویہ اپنی والدہ کے رشتے داروں کے ساتھ بہت غیر دانش مندانہ پاتے ہیں۔ ہماری والدہ اپنے سسرال والے ہر رشتے دار کی عزت کرتی ہیں۔ بزرگوں کی خدمت کرتی ہیں۔ گھر آنے پر خاطر تواضع کرتی ہیں۔ ان کے حقوق کا حتی الامکان خیال رکھتی ہیں۔ مگر ہماری والدہ کے رشتے دار' چاہے بزرگ ہوں یا بچے' آجائیں تو ہمارے والد صاحب کے ماتھے پر تیوریاں چڑھ جاتی ہیں' گھر میں خواہ مخواہ تناؤ کی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ نہ کسی بزرگ کا لحاظ کرتے ہیں' نہ ان کے پاس بیٹھتے ہیں اور نہ خوش دلی سے ان کے سلام اور گفتگو کا جواب دیتے ہیں۔ حالانکہ میرے ننھیال والے کبھی کبھار ہمارے گھر آتے ہیں اور وہ بھی صرف والدہ کے بہن بھائی یا ماں باپ۔ اور ان کے خلوص کا عالم یہ ہے کہ کبھی نہ گلہ کیا نہ شکوہ۔ ہماری امی کے لیے یہ بات کس قدر اذیت دینے والی اور دل توڑنے والی ہے' اس کا اندازہ ہم کرتے ہیں مگر ہماری والدہ کی عظمت اور اعلیٰ ظرفی دیکھیے کہ' وہ پھر بھی ہمیں اس معاملے میں کچھ نہیں کہنے دیتیں کہ تمہارے باپ کی کمائی ہے' وہ جس کو چاہے گھر میں آنے سے روکے' یا پسند کرے یا نہ کرے' ملے یا نہ ملے' اس کا گھر ہے۔ ہر کسی کو اپنا اپنا ظرف اور عمل اپنے رب کو دکھانا ہے۔ ہمارے والد نے اپنے سسرال میں غمی خوشی میں کبھی خوش دلی اور دل کی رضامندی سے شرکت نہیں کی اور لین دین کے معاملے میں بھی ہمیشہ پہلو بچاتے ہیں۔

ہم صرف یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا بیوی کے رشتے دار کے کوئی حقوق نہیں ہوتے؟ ہمارے والد کا کہنا ہے کہ وہ میری ذمہ داری میں نہیں ہیں کہ ان کی شادی' تقاریب وغیرہ میں تحائف دیا کروں؟ وہ ہمیشہ والدہ کے اعزہ واقربا کی تحقیر کرتے ہیں اور استہزا کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ کیا بیوی کا حق نہیں کہ اس کے قریبی رشتے دار اس کے گھر میں آئیں اور وہ ان کی خاطر تواضع کرے۔ ان کے پاس وقت گزارے؟ کیا وہ رشتے داروں کے ساتھ ساتھ مہمان کا درجہ نہیں رکھتے؟ کیا داماد' بہنوئی' ہم زلف کا یہ فرض نہیں کہ وہ گھر میں آئے مہمانوں کو وقت دے؟ کیا ہمارے والد بیمار ذہن

کے مالک ہیں کہ وہ ہماری والدہ کے جذبات کا بالکل احساس نہیں رکھتے؟ کیا گھر کی راج دھانی میں ہماری والدہ کا درجہ صرف سسرال والوں کی اور شوہر کی خادمہ کا ہے؟ ہم اپنی والدہ کی جذباتی کیفیت کو جانتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کی صحت متاثر نہ ہو جائے اور والد کے کبر نفس کا شکار ہو کر ہم اپنی پیاری والدہ سے محروم نہ ہو جائیں۔

دل توڑنے' عزت نفس پامال کرنے' جذبات و احساسات کو ٹھیس پہنچنے پر جو تکلیف ہوتی ہے' کیا اس کی سزا ہوتی ہے؟ جیسے کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ......

جواب: بنیادی طور پر ایک معاشرتی (social) دین ہونے کے سبب اسلام خاندانی نظام' حقوق العباد اور رشتوں کے احترام کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے۔ اس میں وہ رشتے بھی شامل ہیں جو نسبًا یا صہراً وجود میں آتے ہیں' یعنی جن کا تعلق خون سے ہو یا جو عقد نکاح کے نتیجے میں وجود میں آجائیں۔ دونوں کے حوالے سے سورہ النحل میں فرمایا گیا: اللہ تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (مال / خرچ) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کاموں سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے اور تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو (النحل ۱۶:۹۰)۔ اسی مضمون کو سورہ بنی اسرائیل میں یوں فرمایا گیا: اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ (۱۷:۲۶)۔ مزید ملاحظہ ہو سورہ الروم ۳۰:۳۸)۔

حقیقی والدین کے حوالے سے قرآن کریم نے بہت واضح طور پر حکم دیا ہے کہ ان پر خرچ بھی کیا جائے' ان کی بات بھی مانی جائے' اور ان کے بظاہر غیر ضروری تبصروں اور بے جا مطالبات پر اُف بھی نہ کی جائے۔ ہاں' اگر وہ شرک کا حکم دیں تو اطاعت نہ کی جائے۔ عقد نکاح کے نتیجے میں سسر اور ساس سے جو رشتہ قائم ہوتا ہے وہ بھی والدین کی طرح احترام کا رشتہ ہے اور ان کی عزت ویسی ہی کی جانی چاہیے جیسی حقیقی ماں باپ کی کی جاتی ہے۔ ایسے ہی بیوی کے بھائی یا بہن کی حیثیت بھائی یا بہن کی ہو جاتی ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک اسلامی نظام معاشرت کا جز بن جاتا ہے۔

اسلام بیوی کے بھائی بہن یا والد والدہ کے ساتھ کس قسم کا رویہ چاہتا ہے' اسے سمجھنے کے لیے صرف ایک واقعہ کافی ہے۔ یہ بات کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت سیدہ خدیجہؓ سے انتہائی قلبی تعلق تھا۔ حدیث سے ثابت ہے کہ ان کی حقیقی بہن یا بھائی نہیں بلکہ صرف ایک سہیلی جب حضور نبی کریمؐ سے ملنے آتی ہیں تو آپؐ ان کے لیے اپنی چادر مبارک فرش پر بچھا دیتے ہیں!

اگر ایک شوہر اپنی بیوی کے بھائی' بہن یا والدین کے ساتھ بھلائی' نرمی و محبت اور عزت و احترام اور گرم جوشی سے پیش آتا ہے تو یہ ان کا حق ہے' ان پر احسان نہیں ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو حقوق العباد کو پامال کرتا ہے۔ یہ یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق میں معافی دے سکتا ہے مگر حقوق العباد کو معاف

نہیں فرماتا۔ اس لیے ایک شخص کو مثالی باپ بننے کے لیے اس اہم پہلو کی طرف متوجہ ہونا ہو گا اور اپنی اہلیہ کے بھائی اور والدین کی خاطر تواضع اور دل جوئی وغیرہ ویسے ہی کرنی ہو گی جیسی وہ اپنے والدین کی کرتا ہے۔ ان کی حیثیت لازماً ایک مہمان سے بڑھ کر ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں بہت سے طور طریقے ہندستانی معاشرے سے آگئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سسرالی رشتہ داروں کو جنھیں انگریزی میں in laws کہا جاتا ہے' out laws سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کی فوری اصلاح کی ضرورت ہے۔ یہ بیمار ذہن کی نہیں' بیمار ثقافت کی علامت ہے۔

یہ تصور بھی اصلاح طلب ہے کہ بیوی ایک "خادمہ" ہے۔ دراصل سربراہ خاندان' خاندان کا خادم ہے اور بیوی کو یہ حق شریعت نے دیا ہے کہ وہ شوہر کی حیثیت کی مناسبت سے اس سے گھر کے کام کاج کے لیے خادم کا مطالبہ کر سکے۔ رہا جذبات و احساسات کے مجروح ہونے کی "دیت"' تو حقیقت یہ ہے کہ اسلام دوسروں کے احساسات و جذبات کے احترام کا شدت سے قائل ہے اور قرآن و حدیث بار بار خوش گفتاری' نرمی' محبت' عفو و درگزر' قول حسن' قول لین کا ذکر اسی لیے کرتا ہے کہ خیال خاطر احباب کا اہتمام ہو اور دل کے آبگینوں کو ٹھیس نہ پہنچ پائے۔

آپ کو چاہیے کہ دل کو ٹھیس پہنچانے والے کے لیے سزا پر غور کرنے کی جگہ اللہ سے دعا کریں کہ وہ ایسے فرد کو ہدایت دے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کی روشنی میں حقوق العباد کی ادائیگی کی توفیق دے (ڈاکٹر انیس احمد)۔

رضاکارانہ طور پر وراثت سے دست برداری

س : ہم ایک مسلمان ملک میں رہتے ہیں لیکن ہمارے قوانین و روایات اسلام سے متصادم نظر آتی ہیں۔ ان میں وراثت میں لڑکی کا حصہ دینا اور جہیز نمایاں ہیں۔ ہم میں سے جو لوگ صوم و صلوٰۃ کے پابند بھی ہیں ان میں بھی یہ چیز پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی لڑکی اپنے اس حق کا مطالبہ کر لے تو معیوب سمجھی جاتی ہے۔ بہن بھائی اس سے تعلقات تک قطع کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں میرے سوالات یہ ہیں:

۱۔ اگر لڑکی وراثت میں سے اپنا حصہ خود لینا نہیں چاہتی تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہو گی؟۔۔ کیا اسے ایسا کرنا چاہیے یا نہیں؟

۲۔ کیا لڑکی کو جہیز دینے کے بعد وراثت کا حق باقی نہیں رہتا؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہو گی؟

۳۔ والد بیٹے کی معاشی بہبود کا پابند ہے۔ کیا بیٹی کو جہیز دینے کے بعد اس کا معاشی حق ختم ہو جاتا ہے؟ عورت کے معاشی حقوق کیا ہیں؟

ج : آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ ہمارے ہاں بہت سی ایسی رسوم رواج پاگئی ہیں جو اسلام کی واضح تعلیمات کے منافی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکیوں پر دباؤ ڈال کر انھیں وراثت سے محروم کرنا ہے۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کو پامال کرنا ہے اور اس بنا پر تعلقات کا منقطع کرنا قرآن کریم کی اصطلاح میں قطع رحمی ہے' جو ہر لحاظ سے اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

اگر ایک لڑکی بغیر کسی دباؤ کے وراثت میں اپنا حصہ نہ لے یا لینے کے بعد کسی اور کو دے دے' تو اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن اس کو رواج بنانا اسلامی روح کے منافی ہو گا۔ اسلام چاہتا ہے کہ وراثت کے ذریعے مال کا ارتکاز ایک ہاتھ میں نہ ہو اور منفعت میں نسبی رشتہ دار شریک ہوں۔

جہیز کا کوئی تعلق وراثت سے نہیں ہے۔ کیونکہ جو چیز ایک شخص اپنی زندگی میں دیتا ہے وہ گویا ایک ہدیہ ہے اور اصول تملیک کی بنا پر جو جسے چاہے اور جتنا چاہے دے سکتا ہے۔ وراثت صرف اس ترکہ میں ہے جو کسی کے انتقال کے بعد پایا جائے۔ کسی لڑکی کو جہیز دینے سے اس کا حق وراثت ختم نہیں ہو جاتا اور نہ ہی اس میں کمی آجاتی ہے۔

یہ تصور کہ والد لازمی طور پر بیٹے کو اپنے مرنے کے بعد کچھ دے' چاہے وہ اس بنا پر بیٹی کو شرعی حق سے محروم کر دے' ایک غیر منطقی بات ہے۔ اگر ایک شخص کی مالی حالت زیادہ مستحکم نہیں ہے تو وہ اپنی بساط کے مطابق ہی اپنی بیٹی کو جہیز دے اور جس حد تک ممکن ہو بیٹے کے لیے بھی کرے۔ اس کے بیٹے کو بھی یہ بات سمجھنی چاہیے کہ رزق میں وسعت و برکت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور جتنا ایک شخص اللہ کے دین کی پیروی کرتے ہوئے اسے خوش کرنے کے لیے اپنے رشتہ داروں' اولاد وغیرہ پر خرچ کرتا ہے اللہ اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ اسے غیب سے فراہم کر دیتا ہے (ا-ا)۔

زکوٰۃ کا بے جا استعمال

س : حکومت آزاد کشمیر نے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کوٹلی کو ڈھائی لاکھ روپے فراہم کیے ہیں جن کے ساتھ سرکلر میں وضاحت درج ہے کہ یہ رقم زکوٰۃ فنڈ سے فراہم کی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وکلا حضرات (جو کہ خود زکوٰۃ ادا کرنے کے اہل ہیں) بہ حیثیت ادارہ زکوٰۃ فنڈ کی اس رقم سے مستفید ہو سکتے ہیں؟ مثلاً بار روم کی تعمیر' لائبریری کے لیے کتب' پبلک ٹائلٹ کی تعمیر وغیرہ۔ اگر نہیں تو بار اکاؤنٹ میں پہنچ جانے والی زکوٰۃ فنڈ کی رقم کو کس مصرف میں لایا جا سکتا ہے؟

علاوہ ازیں کیا زکوٰۃ فنڈ کی رقم سے وزرا حضرات کا بیرون ملک علاج' دورے وغیرہ نیز مالی طور پر مستحکم' بااثر لوگوں کی تالیف قلب کے لیے استعمال' قرآن وحدیث کی روشنی میں جائز ہے؟

ج : زکوٰۃ کی رقم کے حوالے سے قرآن کریم نے سورہ توبہ میں وضاحت کر دی ہے کہ "یہ صدقات تو

دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو ملاقات کے کام پر مامور ہوں‘ اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا میں اور مسافرنوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے (التوبۃ ۹:۶۰)۔

یہاں جن آٹھ مصارف زکوٰۃ (صدقات) کا ذکر کیا گیا ہے ان پر اگر قیاس بھی کیا جائے تو ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن قطعاً ان میں سے کسی کی تعریف میں نہیں آتی۔

بار ایسوسی ایشن کے ذمہ داروں کا فرض ہے کہ وہ اس رقم کو اللہ تعالٰی کی طرف سے مقرر کردہ مصارف میں استعمال کریں اور جن حضرات نے یہ رقم انھیں دی ہے ان کا بھی فرض ہے کہ دین کے معاملات میں ذمہ دار حضرات سے مشورے کے بعد ہی اس طرح کے اقدامات اٹھائیں۔ زکوٰۃ کی رقم کوئی ٹیکس نہیں ہے کہ اسے جہاں چاہیں مفاد عامہ (public welfare) میں استعمال کریں۔ ان کے استعمالات مخصوص کر دیے گئے ہیں اور انھی میں اس کا استعمال ہونا چاہیے۔

کسی مالی طور پر مستحکم شخص کا زکوٰۃ کی رقم پر بیرون ملک جانا زکوٰۃ کا بے جا استعمال ہے۔ زکوٰۃ کو مالی طور پر مستحکم افراد کی تالیف قلب کے لیے بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی نومسلم ہوں اور ان کی تالیف قلب کے لیے اس کو استعمال کیا جائے تو وہ جائز ہو گا۔ واللّٰہ اعلم بالصواب! (ا-ا)۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے' کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جسے اللہ تعالیٰ نعمت عطا فرمائے' وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔ جسے رزق کے ملنے میں تاخیر نظر آئے' وہ استغفار کرے۔ جسے اچانک کوئی مشکل پیش آئے' وہ لاحول ولاقوۃ الا باللّٰہ پڑھے (بیہقی فی شعب الایمان)۔

کتاب نما

مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، سلطان احمد اصلاحی۔ ناشر: ادارہ علم و ادب، ۴/ ۱۱۳۰، سی حالی نگر، سرسید نگر، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔ صفحات: ۶۴۔ قیمت: ۱۵ روپے۔

مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی (وفات: ۵ دسمبر ۱۹۹۰) کی ذات اس اعتبار سے تو محتاج تعارف نہیں کہ ۱۹۴۸ سے ۱۹۷۲ تک وہ جماعت اسلامی بھارت کے امیر رہے اور اس حیثیت سے انھوں نے اسلامی تحریک اور بھارتی مسلمانوں کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ تقسیم ہند کے بعد امیر جماعت ہند کی ذمہ داری سنبھالنا، بقول مولانا علی میاں: "کانٹوں بھرا تاج سر پر رکھنا یا ہتھیلی میں انگارہ رکھنے کے مرادف تھا، لیکن انھوں نے اس نازک منصب کو صبرواستقامت اور حکمت و فراست سے نبھایا" (کاروان زندگی، ششم، ص ۳۹۴)۔ ان کی شخصی خوبیوں اور کردار کی بلندی سے تحریک اسلامی (خصوصاً بھارت سے باہر) کے حلقے عام طور پر ناواقف ہیں۔ زیر نظر مقالے میں بقول مصنف: ان کی "شخصیت کے چند نمایاں پہلو" پیش کیے گئے ہیں۔

مولانا مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور ندوۃ العلما لکھنؤ سے تعلیم حاصل کر چکے تو علمی و تدریسی دنیا میں ان کے سامنے دنیوی ترقی اور پرکشش مناصب کے وسیع امکانات موجود تھے۔ مگر اپنی درویشانہ افتاد طبع کے سبب انھوں نے اس طرف اعتنا نہیں کیا۔ ان کے بارے میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی راے یہ تھی کہ مولانا ابواللیث ان لوگوں میں سے ہیں جن کی قرآنی حقائق و معارف پر گہری نظر ہے۔ علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کا تاثر یہ تھا کہ وہ، علی میاں سے زیادہ ذہین ہیں۔ جب مولانا سید سلیمان ندوی، پاکستان منتقل ہو گئے تو دارالمصنفین میں ان کی جانشینی کے لیے جن شخصیتوں کے نام زیر غور آئے، ایک روایت کے مطابق، مولانا ابواللیث کا نام ان میں سرفہرست تھا (ص ۱۰)۔

مولانا فقر و درویشی اور استغنا و قناعت کا پیکر تھے۔ بہ قول مقالہ نگار وہ: "راس الفقرا اور راس المساکین" تھے۔ ۱۹۷۲ میں امارت جماعت سے سبک دوشی کے بعد وہ اپنے آبائی وطن میں گوشہ نشین ہوئے تو ابھی ان کے اکلوتے صاحبزادے، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ بیشتر صاحبزادیوں کی شادی اور رخصتی بھی باقی تھی۔ صاحبزادے کو تعلیم ادھوری چھوڑ کر تلاش روزگار میں لگ جانا پڑا۔ مولانا نے ربع

صدی تک دہلی اور رام پور میں شہری سہولتوں (اگرچہ وہ معمولی تھیں) کے ساتھ زندگی بسر کی تھی' اب بلا تامل دیہات کے کچے مکانات میں مقیم ہو گئے۔ ان کی درویشانہ اور فقیرانہ اور دنیا سے بے نیازانہ افتاد طبع پر ہر ایک کو ان کا رطب اللسان پایا۔ دو چارپائیوں کے چھوٹے کچے کمرے میں مولانا خود ہی جھاڑو مار لیتے۔ جس گھر کا یہ نقشہ ہو اس کے اثاثے کا اندازہ آسانی کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے۔ ہم نے جماعت کے بہت سے مخالفین کو رشک بھرے انداز میں بار بار کہتے سنا کہ اگر کسی کو صحابہؓ کی زندگی کا نقشہ دیکھنا ہو تو اس کی ایک جھلک چاندپٹی کے اس گوشے میں جا کر دیکھ لے (ص ۱۸)۔

ان کے ایک دیرینہ شناسا جیوتی سروپ سنگھ' مولانا کے بارے میں لکھتے ہیں: "جماعت اسلامی کے ہر دل عزیز امیر اور قائد ہوتے ہوئے بھی ان کی زندگی میں ایسے نہ جانے کتنے مواقع آئے ہیں جب انھوں نے باسی روٹی اور ترکاری کا ناشتا کر لیا۔ لوگ گواہ ہیں کہ مولانا محترم باسی روٹی شکر کے ساتھ خوشی خوشی کھاتے تھے۔ بارہا مولانا نے' بغیر کرتے یا قمیص اور بنیان کے' شیروانی پہن کر جلسوں میں شرکت کی ہے۔ جماعت نے آپ کی تنخواہ میں اضافہ کرنا چاہا' آپ نے بڑی سختی سے روک دیا (ص ۶۱)۔

"ایک بار سخت بیمار ہو کر آپ اپنے گاؤں چاندپٹی ضلع اعظم گڑھ تشریف لائے اور تین مہینے تک رہ گئے۔ ادارے سے تنخواہ بھیجی جاتی' ہر بار لوٹا دیتے۔ جب لوگوں نے بہت ضد کی تو مولانا نے لکھ بھیجا: "جماعت کوئی خیرات خانہ نہیں ہے۔ جب میں نے کام ہی نہیں کیا تو تنخواہ کس بات کی؟" (ص ۶۱)۔

سروپ سنگھ مزید لکھتے ہیں: "مولانا ابواللیث صاحب کو راہ حق کے اس صبر آزما سفر میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں' وہاں بھی انھوں نے اپنے عمدہ کردار کا نمونہ پیش کیا۔ ان کے کوٹے میں دودھ' گھی' گوشت' انڈے اور چینی منظور کی گئی تھی' مولانا کی بے نیازی دیکھیے' انھوں نے یہ کہہ کر کٹوتی کرا دی کہ "جیل سے باہر کی آزاد فضا میں اس قدر انواع و اقسام کی نعمتوں کا میں عادی نہیں' اس لیے قید و بند کے محدود ایام میں اپنی سادہ غذا کی عادت کو خراب نہیں کر سکتا" (ص ۶۲)۔

سلطان احمد اصلاحی نے زیر نظر قلم برداشتہ مقالے میں مولانا مرحوم کی شخصیت کی بس ایک جھلک ہی دکھائی ہے۔ ایسے بیش بہا انسان کی زندگی تو اس لائق ہے کہ اس کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جائے' خصوصاً دعوتی اور تحریکی زندگی میں انھوں نے جو کارنامہ انجام دیا' اسے تفصیل کے ساتھ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

The Quran, Basic Teachings [قرآن کی بنیادی تعلیمات]' مرتبین: ٹی بی اروِنگ' خورشید احمد' محمد مناظر احسن۔ ناشر: دعوہ اکیڈمی' انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی' اسلام آباد۔ صفحات: ۳۹۶۔ قیمت: درج نہیں۔

یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں رہنے والے اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان' جن کی مادری زبان چاہے کچھ بھی ہو' قرآن کے متن کو ناظرہ پڑھ لیتے ہیں' خواہ اس کے مفہوم سے آگاہی نہ ہو سکے کہ ایک ہی مضمون یا کتاب کو بار بار پڑھنا مشکل کام ہے۔ اس سے پڑھنے والا اکتا جاتا ہے لیکن قرآن کو بار بار' صد ہزار بار پڑھنے سے بھی اکتاہٹ نہیں ہوتی۔

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آبادیوں تو عرصۂ دراز سے علوم اسلامیہ' علوم اقتصاد اور علوم قانون کی ترویج کے لیے کوشاں ہے لیکن اس کے شعبۂ دعوت کی ذمہ دار' دعوہ اکیڈمی وقتاً فوقتاً خصوصی طور پر مختلف النوع تربیتی پروگرام ترتیب دیتی ہے جن کے ذریعے اساتذہ' طلبہ' ائمہ' مدیران اور زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ذمہ داران کے لیے ریفریشر کورس منعقد کیے جاتے ہیں۔ مزید برآں اکیڈمی نے مختلف زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم بھی تیار کرائے ہیں (یا ان پر کام جاری ہے)۔ طلبہ کی ضروریات کے پیش نظر نامور امریکی نومسلم تھامسس بیلنیٹن اروِنگ [الحاج تعلیم علی] صاحب نے (جنھوں نے قرآن کا ترجمہ امریکی انگریزی زبان میں کیا ہے) قرآن حکیم کی چیدہ چیدہ اسلامی تعلیمات کو عربی متن کے ساتھ انگریزی میں مرتب کیا' اس پر محمد مناظر احسن اور پروفیسر خورشید احمد نے نظرثانی کی اور اسے اسلامک فاؤنڈیشن لندن نے خوب صورت گردوپوش کے ساتھ شائع کیا۔

اس مجموعے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے مقدمہ تفہیم القرآن کے چند پیراگراف بھی شامل ہیں۔ بعدازاں قرآن' تصورِ خدا' آخرت' انبیا' عبادات' معاشرہ' معاشی زندگی' ریاست' قانون اور خارجہ پالیسی جیسے عنوانات پر قرآن کریم کی ہدایات درج کی گئی ہیں اور عربی متن کے فوری بعد انگریزی میں اس کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک قابل قدر اور مفید مجموعہ ہے۔ اروِنگ صاحب کا ترجمہ معیاری ہے۔

دعوہ اکیڈمی نے مجموعے کا عکس لے کر اسے شائع کیا۔ ۱۹۹۶ میں اس کے دس ہزار نسخے طبع کیے گئے۔ زیرنظر پاکستانی طباعت زیادہ نفیس اور معیاری نہیں ہے۔ قرآنی کتابوں کی طباعت واشاعت اس کے شایان شان ہونی چاہیے۔ کئی صفحات کی عبارت مدھم ہے' کہیں لفظ اڑے ہوئے ہیں۔ (محمد ایوب منیر)

مجلہ آیات' مدیر: ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی۔ سنٹر فار اسٹڈیز آن سائنس' الحمدہ' مزمل منزل' دودھ پور' علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱۔ صفحات: ۳۱۲۔ قیمت: ۳۵ روپے۔

مرکز الدراسات العلمیہ کا یہ مجلہ سال میں تین مرتبہ شائع ہوتا ہے مگر زیرنظر شمارہ ۱۹۹۷ کے تین شماروں کو یک جا کر کے شائع کیا گیا ہے۔ یہ شمارہ جنوری تا دسمبر ۱۹۹۷ء کا ہے۔ ادارہ انگریزی میں ششماہی

MAAS Journal of Islamic Science بھی شائع کرتا ہے۔ یہ ادارہ یا مرکز "اسلامی سائنس" کے تصور کا ترجمان ہے جس کی ایک عمدہ مثال اس سائنسی روایت میں ملتی ہے جو بنوامیہ اور بنوعباس کے دور کے مسلمان سائنس دانوں کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ مرکز الدراسات اس روایت کا احیا چاہتا ہے۔

زیرنظر شمارے میں چند اہم مسلمان سائنس دانوں کے حالات اور کارناموں پر مقالات شامل ہیں۔ مقالات معیاری ہیں اور حوالہ جات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ خالد بن یزید، جابر بن حیان، طغرائی، الکندی، علی بن ایدمرالجدکی اور البیرونی پر مقالات بغداد کے فاضل احمد الطائی صاحب کے تحریر کردہ ہیں اور ان کا ترجمہ محمد احسن نیازی صاحب نے کیا ہے۔ ابن سینا کے کارناموں پر سکندر حسین اور میکائل ای مارمورا صاحب نے قلم اٹھایا ہے۔ ایک نہایت اہم اور دل چسپ مضمون "سارٹن اور عربی اسلامی ورثہ" ہے، جسے امریکہ کے سمیع ہمرینہ نے تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں ایک طرف تو یورپی محقق جارج سارٹن کی علمی دیانت داری کا تذکرہ ہے، دوسری طرف اس کے ساتھیوں کے عمومی تعصب کا ذکر ہے جو اس بات کو بھی برداشت نہ کرپائے کہ ایک یورپی تاریخ دان مسلمان سائنس دانوں کے کارناموں کو تسلیم کرے۔ آخری مضمون پروفیسر محمد طفیل ہاشمی صاحب کا ہے: "سائنسی کتب، تراجم اور مترجمین"۔

مجلّے میں ایک خط بھی شائع کیا گیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ "آیات" کے ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۶ کے شمارے کے اداریے میں اس بات پر تنقید کی گئی ہے کہ اکثر عربی تحریروں میں لفظ "علم" استعمال کیا جاتا ہے اور مراد سائنس ہوتی ہے۔ مدیر آیات کا یہ کہنا بجا ہے کہ "علم" سائنس تک محدود نہیں، لہٰذا اس غلطی کی اصلاح ہونی چاہیے۔ سوال البتہ یہ ہے کہ کیا خود مدیر مجلّہ اپنے Centre for Studies on Science کا ترجمہ مرکزالدراسات العلمیہ کر کے اس غلطی کے مرتکب نہیں ہو رہے؟ (ڈاکٹر بلال مسعود)

اسلامی قیادت از خرم مراد۔ ناشر: منشورات، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۹۶۔ قیمت: ۲۱ روپے۔

۱۰۰ صفحے سے بھی کم کی یہ کتاب، دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق ہے۔ محترم خرم مراد کی زندگی قرآن کے مطالب کو سمجھنے میں گزری ہے، اس کا اندازہ ان کو سننے والوں اور پڑھنے والوں کو بخوبی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے سیرت پاک کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں کیا ہے۔ یہ ایک منفرد نوعیت کا مطالعہ ہے جس سے غوروفکر کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ انھوں نے مطالعے کی بنیاد اس بات کو بنایا ہے کہ قرآن میں رسولؐ اللہ کو خطاب کر کے جو بات کہی گئی، آپؐ نے اس پر عمل کیا۔ گویا وہ بات، آپؐ کی زندگی میں بالفعل موجود تھی۔ اسی طرح جو صفات بیان کی گئی ہیں، وہ بھی نظری نہیں ہیں بلکہ واقعتاً پائی جاتی تھیں۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر انھوں نے آپؐ اور مقاصد دعوت، آپؐ اور مقام دعوت، آپؐ اور

مخاطبین دعوت' آپؐ اور رفقاے دعوت کے چار ابواب قائم کیے ہیں اور ہر ایک کے ذیل میں پانچ سے دس تک عنوانات قائم کر کے قرآنی آیات کا انتخاب اور اس کی روشنی میں سیرت کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آج کے دور میں جو لوگ قافلۂ تحریک اسلامی میں شامل ہیں' ان کے لیے یہ اسوۂ رسولؐ کیا رہنمائی پیش کرتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے کے دوران رسولؐ اللہ ایک داعی کی حیثیت سے چلتے پھرتے' صحابہؓ کے ساتھ معاملات کرتے' مخالفوں کا مقابلہ کرتے غرض ایک بھرپور زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔ صرف ایک باب آپؐ اور رفقاے دعوت کے درج ذیل عنوانات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنے رفقا کے ساتھ آپؐ کے تعلق کو کس انداز سے بیان کیا گیا ہے: رؤف رحیم' قدروقیمت کا احساس اور ربط' تعلیم اور تزکیہ' نگرانی اور احتساب' استعداد اور صلاحیت کے مطابق معاملہ' نرم دلی اور نرم خوئی' عفوودرگزر' مشاورت اور تواضع۔

ہر کارکن کے لیے بالعموم اور جو لوگ ذمہ داری یا قیادت کے منصب پر فائز ہیں' ان کے لیے بالخصوص عمل کی واضح شاہراہ سامنے آتی ہے بلکہ اپنے آپ کو جانچنے کا ایک پیمانہ ہاتھ آجاتا ہے کہ وہ اپنا جائزہ لے کہ وہ کہاں تک وہ صفات رکھتا ہے جو داعیانہ منصب کا تقاضا ہیں' جن کا نمونہ رسول اللہ نے پیش کیا ہے اور جن کی تعلیم قرآن نے دی ہے۔

یہ کتاب پہلے بھی شائع ہو چکی ہے۔ اب اسے منشورات نے اپنے اعلیٰ معیار پر شائع کیا ہے۔

تبصرہ نگار کی رائے میں اسے ہر ذمہ دار اور ہر کارکن کو ضرور پڑھنا چاہیے بلکہ اسٹڈی سرکل میں اس کا اجتماعی مطالعہ کیا جانا چاہیے (مسلم سجاد)

شیئرز بازار میں سرمایہ کاری' ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی۔ ناشر: ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی' پان والی کوٹھی' دودھ پور' علی گڑھ۔ صفحات: ۱۵۵۔ قیمت' مجلد: ۵۰ روپے' کاغذی جلد: ۳۵ روپے۔

شیئرز مارکیٹ' دور حاضر کی معاشی زندگی میں بیرومیٹر کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے اتار چڑھاو اور انڈکس سے کسی ملک کے معاشی استحکام یا عدم استحکام کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ افراد ہی نہیں' حکومتیں اور غیر ملکی سرمایہ کار بھی شیئرز مارکیٹ میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ بین الاقوامی قوتیں جب کسی ملک کو عدم استحکام کا شکار کرنا چاہتی ہیں تو وہ شاک ایکسچینج کو بھی ذریعہ بناتی ہیں۔ غرضیکہ شیئرز مارکیٹ آج کی مارکیٹ اکانومی میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے' لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ دنیا بھر میں تو روزانہ اخبارات اس کے لیے صفحات کے صفحات مختص کرتے ہیں لیکن ہمارے اردو اخبارات اس موضوع سے تقریباً خالی ہوتے

ہیں۔ اس موضوع پر اردو میں لٹریچر نہ ہونے کے برابر ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں ایک تو کتاب میں شیئرز مارکیٹ کی ماہیت، حصص، اقسام، اسٹاک ایکسچینج اور اس کے عمل (working) اور شیئرز کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کی وجوہ پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے اور دوسرے شیئرز بازار میں پائی جانے والی بدعنوانیوں اور خرابیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں شیئرز پر علما اور مسلم ماہرین معاشیات کی آرا کو یک جا کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف نے حل طلب مسائل کے ضمن میں علما کرام اور مسلم ماہرین معاشیات کو دعوت غور و فکر دی ہے۔ کتاب کا آخری باب کمپنیوں کے حصص پر زکوٰۃ کے مسئلے سے متعلق ہے۔ فاضل مصنف نے شیئرز کے حوالے سے زکوٰۃ کے اطلاق اور ادایگی کے مسئلے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

آخر میں کتابیات اور اصطلاحات کی فہرست بھی شامل ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک گراں قدر کتاب ہے **(میاں محمد اکرم)**۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل، کتاب و سنت کی روشنی میں، مفتی محمد حسام اللہ شریفی۔ پتا: مکتبہ رشیدیہ، اردو بازار، کراچی۔ صفحات: ۴۳۱۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

شریفی صاحب اخبار جہاں میں دینی مسائل کے بارے جو مختصر جوابات دیتے رہے، اس کتاب میں انھیں یک جا کر کے موضوع وار مرتب کیا گیا ہے۔ دائرہ موضوعات وسیع ہے (نماز، عمرہ، حج، قربانی، نکاح، طلاق، خاندانی منصوبہ بندی، زوجین کے فرائض اور حقوق، غسل، مسجد سے متعلق امور وغیرہ) ایک ہی موضوع پر سوال جواب میں تکرار کھٹکتی ہے۔ ملتے جلتے سوالات کا ایک جامع جواب بنا لیا جاتا تو بہتر ہوتا، جیسے: ص ۲۸۸، ۲۸۹ پر شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کی عمر سے متعلق سات سوالات، اصل میں تو ایک ہی سوال ہے۔ اس کا ایک جامع جواب دیا جاتا تو کافی و شافی ہوتا۔ اس طرح نصف جگہ کی بچت ہوتی، کتاب کی ضخامت کم ہوتی اور قیمت بھی۔ دراصل کتاب کی تدوین (ایڈیٹنگ) کی ضرورت تھی۔ یہ اعتراض نہیں، فقط ایک مشورہ یا تدبیر ہے۔ تدوین میں نظرثانی بھی ہو جاتی اور کتاب کہیں زیادہ وقیع بن جاتی۔ ص ۲۸۸ پر ایک سوال جواب اس طرح ہے:

سوال: شادی کے وقت ہلا گلا کرنا اور تقریب منعقد کرنا کیسا ہے؟

جواب: ایک حد تک اس کی اجازت ہے۔

ہمارے خیال میں یہ جملہ یوں بہتر ہوتا: "حدود شریعت کے اندر اس کی اجازت ہے"۔

زیادہ تر جوابات میں اختصار کے سبب خاصی تشنگی محسوس ہوتی ہے، مثلاً: اس سوال کے جواب میں کہ:

"استخارہ کرنے کا طریقہ کیا ہے؟" فقط یہ کہہ دینا کہ نماز کی عام کتابوں میں استخارہ کا طریقہ تفصیل سے درج ہے، وہاں دیکھ لیا جائے" (ص ۵۴) ٹالنے والی بات لگتی ہے یا دعاے استخارہ بتانے کے بجاے صرف اس کا ترجمہ لکھ دینا بالکل ناکافی ہے۔

چند سوالات کراچی کے پریشان کن حالات کے بارے میں ہیں، جواب میں مفتی حسام اللہ شریفی بالکل بجا فرماتے ہیں کہ کراچی میں بے اطمینانی، بے سکونی اور خوف کی کیفیت اسی صورت میں ختم ہو سکتی ہے جب ہم اپنے گناہوں سے توبہ کر لیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادایگی کا اہتمام کریں اور رزق حرام سے اپنے آپ کو ہر صورت میں بچائیں۔ ہمیں اپنے رب سے تعلق کو مضبوط کرنے اور صحیح مسلمان بننے کی ضرورت ہے، اس کے بغیر کراچی کے حالات درست نہیں ہو سکتے (ص ۱۱۱)۔

مجموعی طور پر جوابات صحیح اور متوازن ہیں۔ مفتی صاحب نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر مختصر مگر عمدہ جواب دیے ہیں۔ یہ کتاب ایسے قارئین کے لیے ہے جو لمبی چوڑی دلیلیں نہیں مانگتے، شریعت کا دو ٹوک جواب جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں (ر-ہ)۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا، محمد موسیٰ بھٹو۔ ناشر: سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، ۴۰۰ بی، پیپلز کالونی، لطیف آباد نمبر ۴، حیدر آباد۔ صفحات: ۲۱۶۔ قیمت: ۵۰ روپے۔

محمد موسیٰ بھٹو کے مضامین کا زیر نظر مجموعہ "زندگی کو بدلنے کی دعوت و پیغام" کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ مضامین کے عنوانات یہ ہیں: جدید عالمی نظام کی تشکیل، ہماری اجتماعی خرابیاں اور ان کے حل کا لائحہ عمل، آنے والی تباہی سے بچنے کا پروگرام، قومی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صورت، ہماری حالت زار، بنیادی اسباب کا جائزہ، ہمارا آج کا دانش ور، ایک نفسیاتی تجزیہ، قومی اور علمی ادارے اور بے غرضی و بے نفسی کا مسئلہ، کتاب سے بیزاری کی فضا اور اس کے المناک نتائج، آزادی اور غلامی کا فلسفہ، اپنی قوتوں کو سمجھنے کا مسئلہ، اجتماعی ذہن کا فقدان ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ اور چیلنج، محبت کا فلسفہ اور دعوت کا منہاج، پاکستان کے نظام تعلیم میں تبدیلی کے لیے حکمت عملی، اخلاقی تربیت کے نظام میں صالح افراد کا کردار۔ ان سے لکھنے والے کی دردمندی، اضطراب، ملت اسلامیہ کے ساتھ والہانہ تعلق، اسلامی تہذیب کے احیا کے لیے تڑپ اور مسلمانوں کی حالت زار کو بدلنے کا بے پناہ جذبہ نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ بہ قول مصنف: "پڑھنے والے [ان] مضامین میں نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے غور و فکر کے بہت سارے نکات محسوس کریں گے"۔

محمد موسیٰ بھٹو کو افراد امت میں مادہ پرستی، نفسی قوتوں اور خواہشوں کی منہ زوری، روحانی قوتوں کی

کی اور تربیت اخلاق کے فقدان پر بے حد تشویش ہے۔ ان کے نزدیک ہمیں سب سے زیادہ ضرورت اپنے باطن کی تربیت و تہذیب کی ہے اور اس کے لیے وہ روحانی شخصیات کی "صحبت" کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس سے انسان کو حرارت، تازگی اور نئی ایمانی قوت ملتی ہے۔ ایک مضمون میں انھوں نے سندھ کے سیکولر دانش ور محمد ابراہیم جویو کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ ایک محنتی اور جفاکش انسان نے اپنی پوری زندگی سیکولر اور مادی خیالات کی ترویج کے لیے کھپا دی اور اپنے نظریے کے لیے خاموش حکمت عملی سے کام کیا۔ پھر وہ بڑی دردمندی سے ابراہیم جویو کی محرومی کا ذکر کرتے ہیں جس نے ہزارہا صفحے لکھے مگر اسلام اور پاکستان کی حمایت میں وہ پانچ سطریں بھی نہ لکھ سکا۔ بلاشبہ ہدایت، توفیق الٰہی پر منحصر ہے۔

آخری حصے میں "گل دستہ" کے تحت بعض شخصیتوں کا مختصر تعارف اور ان کے خطوں کے عکس شامل ہیں (ر- ہ)۔

پھول پھول خوشبو، عتیق الرحمٰن صدیقی۔ ناشر: نور اسلام اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، پوسٹ بکس نمبر ۵۱۲۶، لاہور۔ صفحات: ۲۰۲۔ قیمت: ۸۰ روپے۔

ماہنامہ نونہال ایک طویل مدت سے نظم و نثر میں بچوں کے لیے قابل قدر مواد پیش کر رہا ہے۔ اس ماہنامے نے اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اوصاف کی ترویج کے لیے ہر دور میں معیاری تحریریں شائع کی ہیں۔

جناب عتیق الرحمٰن صدیقی بنیادی طور پر معلم ہیں۔ گذشتہ ۱۵ برسوں سے وہ نونہال میں بچوں کے لیے مضامین لکھ رہے ہیں۔ متنوع موضوعات پر ان مضامین میں اخلاق عالیہ کی ترویج کا جذبہ فراواں نظر آتا ہے۔ اس مجموعے میں ۶۰ ایسے مضامین شامل ہیں جو آداب زندگی، اخلاقیات اور معاشرت پر مثبت انداز فکر کو خوب صورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔

ایک کہانی کار کی طرح صدیقی صاحب کا انداز بہت سادہ اور متاثر کن ہے۔ انھوں نے نامانوس الفاظ سے تحریر کو پیچیدہ نہیں بنایا۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے کتاب کے دیباچے میں، ان مضامین کی معنوی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ، ان کے اثرانگیز اسلوب کو سراہا ہے۔ بچوں کی تربیت کے نقطۂ نظر سے یہ ایک قابل قدر تصنیف ہے۔ ہماری تجویز ہے کہ گھر میں بچوں کو جمع کر کے اس کا ایک ایک باب پڑھ کر سنایا جائے یا مدرسے میں بہ طور سبق انھیں پڑھایا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کے لیے ایسا لٹریچر مسلسل تصنیف کیا جاتا رہے جو انھیں باعمل مسلمان اور اچھے پاکستانی شہری بنانے کی طرف راغب کرے (م - ا - م)۔

مدیر کے نام

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی' کراچی

"مولانا علی میاں" " (فروری ۲۰۰۰) خاصا معلوماتی ہے' لیکن مولانا مرحوم کے سوانح حیات سے متعلق بعض باتیں اس میں درست نہیں' میں ان کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

۱۔ مضمون میں ص ۶۷ پر مولانا مرحوم کی تاریخ پیدائش ۱۱ محرم ۱۳۳۳ھ (جنوری ۱۹۱۴) دی گئی ہے' جو درست نہیں ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنی خودنوشت کاروان زندگی (ص ۳۵' ج اول) میں اپنی تاریخ پیدائش ۶ محرم ۱۳۳۳ھ (مطابق ۲۵ نومبر ۱۹۱۴) لکھی ہے۔

۲۔ یہ درست نہیں ہے کہ مرحوم نے اپنی ابتدائی تعلیم سے قبل قرآن حفظ کیا۔ میں عینی شاہد ہوں کہ میرے حجاز مقدس اور مصر کے پہلے سفر سے رام پور واپسی کے بعد ۱۹۵۵ کے رمضان المبارک میں مولانا نے مجھے اپنی خاندانی بستی تکیہ کلاں کی مسجد میں تراویح میں قرآن سنانے کے لیے بلایا تو اس زمانے میں وہ دن کے اوقات میں اپنی اس مسجد میں حفظ قرآن کرتے تھے اور مجھے اس وقت ان کے بھانجے نے بتایا تھا کہ ۱۵ پارے حفظ کر چکے ہیں۔ اس وقت مولانا مرحوم کی عمر ۴۱ سال تھی۔ اب مجھے ان کے ایک پاکستانی شاگرد سے معلوم ہوا کہ مرحوم ۱۹۶۳ میں ۲۱ یا ۲۲ پارے حفظ کر چکے تھے اور اس شاگرد نے خود مولانا مرحوم کے پیچھے ۶۳ کے رمضان کی تراویح میں اس قدر قرآن' مرحوم سے سنا تھا' باقی پارے کسی اور نے سنائے۔ ہو سکتا ہے کہ مرحوم نے بعد کے برسوں میں پورا قرآن حفظ کر لیا ہو۔

۳۔ مولانا مرحوم کی تعلیم کے سلسلے میں بھی معلومات نادرست اور مبہم ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی اعلیٰ تعلیم لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبہ عربی سے شروع ہوئی' جہاں مولانا نے ۱۹۲۷ میں ۱۴ سال کی عمر میں فاضل ادب عربی کے درجے میں داخلہ لیا تھا اور اس وقت یونی ورسٹی میں سب سے کم عمر طالب علم تھے۔ ۱۹۲۹ میں یہاں سے فاضل ادب عربی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اس سے قبل مولانا کی عربی تعلیم استاذ خلیل عرب یمنی کے ہاتھوں ہوئی تھی' اور پھر دو سال مولانا مرحوم نے ندوہ میں حدیث و فقہ کی تعلیم وہاں کے مشہور اساتذہ مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی محدث اور فقہ کی تعلیم مولانا شبلی جیراجپوری (یہ علامہ شبلی نہیں) سے حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ میں صرف چار ماہ کے لیے دیوبند رہے جہاں مولانا حسین احمد مدنی" سے بخاری و ترمذی پڑھی' اور اس سال کے آخر میں (دسمبر ۱۹۳۲) تین ماہ کے ترجمہ و تفسیر قرآن کا کورس مولانا احمد علی لاہوری" سے مدرسہ قاسم العلوم میں پڑھا۔ درحقیقت مولانا مرحوم کی تحصیل علم ابن خلدون کے بتائے ہوئے طریقے پر ان کے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے مشورہ و ہدایت سے ہوئی' یعنی ایک ایک علم کی تحصیل ایک ایک وقت میں' عربی زبان و ادب' پھر حدیث' پھر فقہ' پھر تفسیر قرآن۔

۴۔ یہ درست نہیں کہ تاریخ دعوت و عزیمت مولانا مرحوم کی آخری کتاب ہے۔ یہ کتاب تو ۱۹۸۴ میں تکمیل پذیر ہو گئی تھی۔ اس کے بعد مولانا کی متعدد کتابیں طبع ہوئیں۔ جن میں المرتضیٰ (۱۹۸۹) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جس کی برعظیم اور عالم عرب میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد مختلف رسائل کے علاوہ کاروان زندگی کے تین حصے' چوتھا پانچواں' چھٹا

علی الترتیب ۱۹۹۱، ۱۹۹۳، ۱۹۹۴ میں طبع ہوئے، اور آخری حصہ ہفتم تو فالج کے بعد افاقہ ہونے کی صورت میں ۱۹۹۹ کے آخری مہینوں میں املا کرایا اور وفات سے دو ماہ قبل طبع ہوا۔

۵۔ یہ بات درست نہیں کہ ۱۹۳۷ میں سید رشید رضا کے مشہور مجلہ المنار میں مولانا مرحوم کا پہلا عربی مضمون "سید احمد شہید" شائع ہوا (ص ۷۱)۔ مولانا نے خود کاروان زندگی، جلد اول میں لکھا ہے کہ "یہ مضمون رسالے کی شکل میں مصر میں ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۱ء) میں شائع ہوا۔ اس وقت میری عمر ۱۶ سال کی رہی ہوگی"۔

ابوداود، لاہور

"مولانا علی میاں" (فروری ۲۰۰۰) سے مولانا کی زندگی اور خدمات کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آئے مگر ایک مقام پر مولانا کے اسلوب کا تذکرہ کرتے ہوئے مختلف مفکرین کے حوالے سے "مولانا مودودی کی عقلیت اور تصور دین کی جامعیت" (ص ۷۹) کا ذکر کیا گیا ہے۔ درحقیقت "عقلیت" سے ایسا جدید ذہن مراد لیا جاتا ہے جو معاملات کو صرف عقل و منطق کے معیار پر پرکھتا ہے، جہاں عقل سے ماورا باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ یہ عقلیت مولانا کے ہاں نہیں ہے۔ درپیش مسائل کو دین کی روشنی میں جامعیت کے ساتھ پیش کرنا اور حالات پر منطبق کرنا مولانا مودودی کا نمایاں وصف ہے۔ جس خوب صورتی سے یہ امتزاج ان کے ہاں پایا جاتا ہے دیگر ہم عصروں میں اس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔

سید عرفان منور گیلانی، ڈنمارک

نئی صدی عیسوی کے تناظر میں عبدالرشید صدیقی کا مضمون "تحریک اسلامی اور اس کے عالمی اثرات" (فروری ۲۰۰۰) بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ البتہ ان کا یہ تجزیہ محل نظر ہے: مغرب کو اس بات کا احساس ہے کہ اگر عالم اسلام کے وسائل اسلام پسندوں کے ہاتھ آجائیں تو وہ مغرب کو تیل اور دیگر تمام پیداوار سے محروم کردیں گے اور یہ مغرب کی معاشی تباہی کے مترادف ہوگا (ص ۵۴)۔ گمان ہے کہ صاحب مضمون کا منشا یہ نہ ہوگا۔ الفاظ کا انتخاب درست نہ ہو سکا۔

خالد ندیم، دہلی

گذشتہ چار برسوں سے میں ترجمان کا قاری ہوں۔ اس مصروف زندگی میں جہاں مطالعہ و علمی مجلسوں کا وقت نہیں ہوتا، یہ پرچہ ہی میری فکر و نظر کی غذا، رہنمائی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ البتہ خرم مراد کے بعد اس میں تزکیہ، مقام دعوت، داعیانہ کردار کی تڑپ، طلب و شوق کا سامان کم پاتا ہوں۔ میرے نزدیک ایک اہم پہلو جن پر بہت کم ہمارے حلقوں میں سوچا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ نشات ثانیہ اور صنعتی زرعی انقلاب کے بعد آج انسانیت ایک نئے عالمی انقلاب کی زد پر ہے۔ ہم خواہی نہ خواہی سلی کون ویلی کے باشندے بننے پر مجبور ہیں۔ ہماری زندگی کا کوئی گوشہ ابلاغی ٹکنالوجی سے محفوظ نہیں۔ حالات حاضرہ کے ان مسائل پر ہمارے اہل قلم، دانش ور کیوں خاموش ہیں، اور تو اور ترجمان القرآن بھی!

سعد، کورنگی، کراچی

اردو اخبارات کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ انگریزی پریس میں لبرل ازم، ہیومن بلکہ ویمن رائٹ کے لبادے میں جو خیالات پیش کیے جارہے ہیں، وہ یہاں "اسلامی ایڈیشن" میں موجود ہیں۔ یہ صرف تحریریں نہیں ہیں، بڑے پیمانے پر ان کا نفوذ بھی ہے۔ مجھ ایسا کم علم و کم مشاہدہ رکھنے والا شخص بھی اداروں، فیکٹریوں اور دفاتر میں خواتین میں اس کے اثرات کو بہ خوبی دیکھ

سکتا ہے۔ بیشتر خواتین خاموش ہیں، لیکن زیر اثر انھی کے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارا فکری محاذ خاموش ہے۔ آنکھیں بند کر لینے سے طوفان ٹل نہیں جائے گا۔ مسائل کا ادراک کیجیے، سامنا کیجیے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں وہ کہیں پڑھا نہیں جاتا اور جہاں عوام الناس پڑھتے ہیں وہاں ہمارا موقف چھپتا ہی نہیں ہے۔ نتیجتاً عوام ہمیں کم ظرف و کم علم مذہبی طبقے کے ساتھ کھڑا کر دیتے ہیں یا کاروکاری ایسی رسم کا ارتکاب کرنے والوں کی قطار میں کھڑا کر کے گن لیتے ہیں۔

آہ!---- آج سید مودودیؒ نہ ہوئے۔ وہ حیات ہوتے تو کم از کم ایسی بے بسی کا احساس نہ ہوتا۔ ایسی فکری تنہائی نہ ہوتی!

غوث محی الدین، کراچی

"اسلام کے لبادے میں" (جنوری ۲۰۰۰) قابل تحسین ہے۔ یہ تحریر مغرب کے دانش وروں کی فکر کی نہج کو سمجھنے کا ایک ذریعہ بن سکتی ہے۔ ڈینیل پائپز ڈائرکٹر مڈل ایسٹ فورم، کینیڈا نہیں، امریکہ ہیں، نہ صرف ڈائرکٹر بلکہ نائب صدر ہیں۔ Foreign Policy Research Institute ایک ادارہ ہے جو فلاڈلفیا میں قائم ہے اس میں ۱۲ سینیر تحقیق کار ہیں۔ اس کا بجٹ ۴ء۴ ملین ڈالر ہے۔ ہر تحقیق کار کا دائرہ علاحدہ ہے وہ اپنے اپنے دائرے میں ریسرچ کرتا ہے۔ ایف پی آر آئی کا اسٹاف ۱۲۳ افراد پر مشتمل ہے۔ یہ اپنی ریسرچ، مطبوعات اور تعلیمی پروگرام کے ذریعے ذہنی فضا کو متاثر کرتا ہے جس پر امریکہ کی خارجہ پالیسی استوار ہوتی ہے۔

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور سے شائع کیا

C.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE,